پندرہ روزہ

چنگاری دہلی

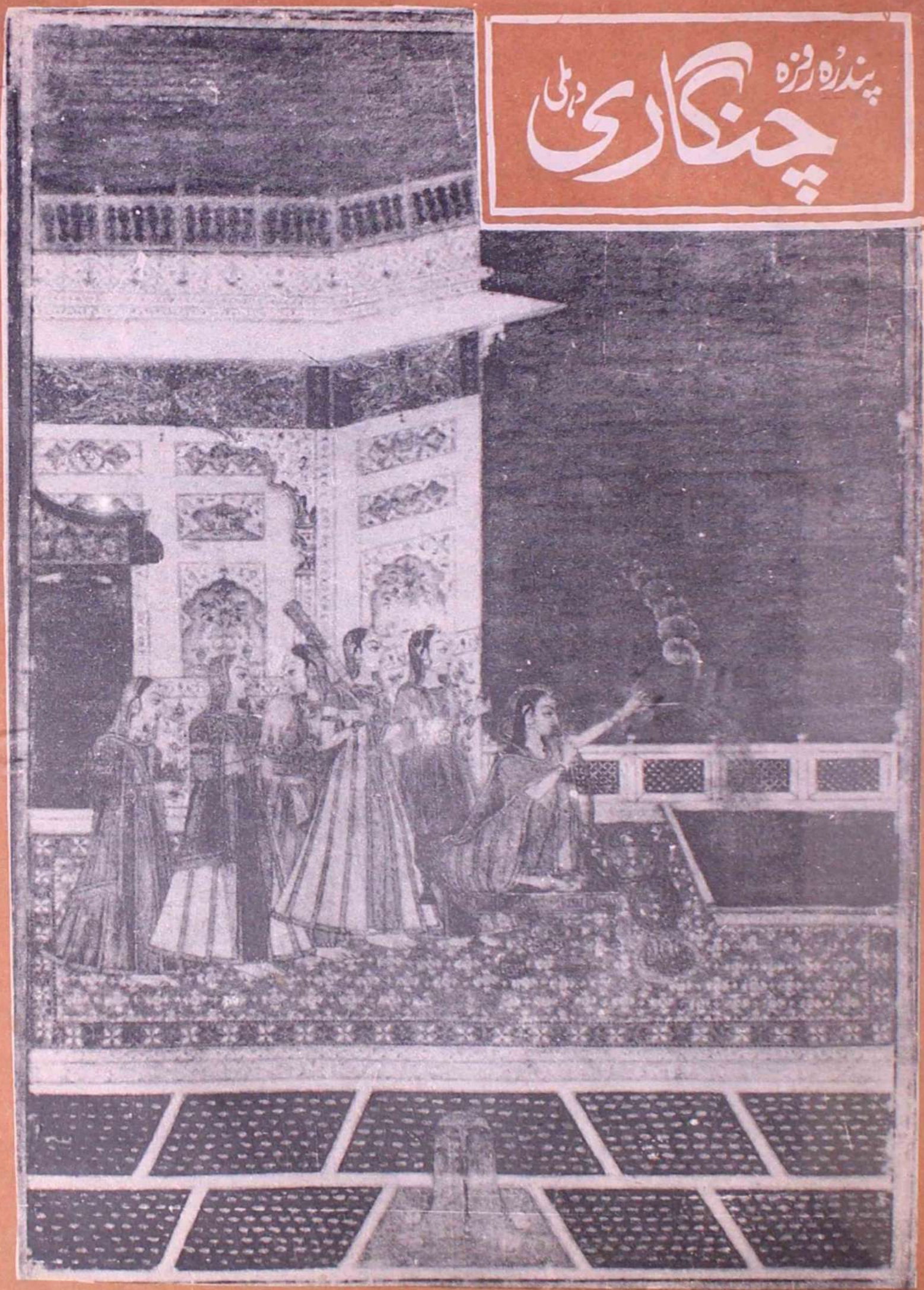

پندرہ روزہ

چنگاری دہلی

ایڈیٹر:
جمیلہ احمد
ادبی حصّے کی ترتیب
بشیر احمد
انیس احمد خاں
شمارہ نمبر ـــــ ۲۵
قیمت: ۲ روپے
سالانہ: ۴۵ روپے
پتہ: ۳/۱۰۱۴ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے
جے کے آفسٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر
۳/۱۰۱۴ رام نگر دہلی ۳۲ سے شائع کیا۔

خصوصی مضمون جس کی اشاعت کا گزشتہ شمارہ میں اعلان کیا گیا تھا بعض دُشواریوں کی وجہ سے اس شمارے میں شریک نہ ہو سکا۔ ہم قارئین سے معذرت چاہتے ہیں۔

ادارہ

اس شمارے میں

دامن نگاہ کا	خطوط	۲
ہم کیا ہماری شخصیت کیا	قرۃ العین حیدر	
تخلیق بہ مقابل تنقید۔	شمس الرحمٰن فاروقی۔ قرۃ العین حیدر	۵
قرۃ العین حیدر۔ اپنی تلاش میں	فتح محمد ملک	۷
معروضی تنقید	رفاد فتیحی	۱۳
جدّوجہد آزادی	راجونت سنگھ رانا	۱۵
سازِ سخن		
اسعد بدایونی		۱۷
اندر سروپ دت نادان، ڈاکٹر محمد یعقوب عامر		۱۸
آشفتہ چنگیزی		۱۹
حدیثِ دل		
اقبال عمر		۱۷
عشرت صدیقی، عشرت ظفر، جنید حزیں لاری، طالب عرفانی		۲۲
راشد جمال فاروقی، ذکی طارق، عذرا نکہت ٹونکی		۲۳
سازِ ہستی		
چٹان (افسانہ)	شوکت حیات	۲۴
گھر "	محمد اسد اللہ	۲۶
دوسرا رُخ "	نیاز محمد اعظمی	۳۰
سخن در سخن	خامہ بگوش	۳۲
کتابوں کی باتیں	ب۔ا۔ رام لعل نابھوی	۳۷

دامن نگاہ کا

میں اس وقت امریکا اور کینیڈا کے لئے پا بہ رکاب ہوں۔ کینیڈا کی دو یونیورسٹیوں اور امریکا کی ایک یونیورسٹی میں لیکچر ہے۔ ان دنوں مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ تین لیکچروں میں ایک ابھی تک ۔۔۔ نامکمل ہے۔ یہ خط آپ کو پالم ایرپورٹ، نئی دہلی سے لکھ رہا ہوں۔ اس وقت صبح کے دو بجے ہیں۔ تین بجے سیکورٹی چیک کے لئے ہم لوگ چل پڑیں گے۔ سوچا اسی وقت یہ عریضہ آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں۔

انشاء اللہ سفر سے واپسی پر "چنگاری" کے لئے کچھ نہ کچھ حاضر کروں گا۔

جگن ناتھ آزاد

• • •

"چنگاری" کے جو شمارے مجھے اب تک ملے، ان کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ "چنگاری" ایک بہترین مکسچر ہے۔ ایک ایسا مکسچر جو کئی امراض میں کام آئے۔ دلوں کو بہلائے اور دماغ پر بوجھ بھی نہ بنے۔ لہٰذا آج کے دور میں اس قسم کے "مکسچر" اگر ضروری پبلسٹی کی جا سکے تو جلد مارکیٹ پکڑے گا اور آپ کو کامیابی ہوگی۔

آجکل میں افسانہ نگار نہیں ہوں۔ عموماً ادبی اور تحقیقی مضامین لکھتا ہوں اور یہ مضامین اکثر طویل ہوتے ہیں اور نہایت خشک۔ لہٰذا وہ "چنگاری" کے لائق نہیں۔ آج سے ۲۰، ۲۵، برس پہلے میں افسانے لکھا کرتا تھا۔ پھر نہ معلوم کیوں افسانوں کی آمد بند ہوگئی اور میں مضامین لکھنے لگا اور لوگ بھول گئے کہ میں نے بھی کئی افسانے لکھے ہیں اور میرے افسانوں کے دو مجموعے بھی آج سے ۲۰، ۲۱ برس پہلے شائع ہو چکے ہیں جو کتابیں آج نایاب ہیں۔ اس کے بعد ۱۸ تحقیقی اور ادبی کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں جن کی بدولت مجھے کئی چھوٹے بڑے (سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری) انعامات پانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

لیکن "چنگاری" کے شماروں کو پڑھ کر دل نے کہا کہ پھر سے افسانے لکھوں۔ لہٰذا میں نے ایک افسانہ "گوتو کی ماں" لکھا ہے جو آپ کی خدمت میں حاضر کر رہا ہوں۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

• • •

سجاد ظہیر صاحب کا شعری مجموعہ "پگھلا نیلم" اور ایک اچھی سی تصویر روانہ کر رہا ہوں۔

فیض صاحب نے اپریل ۱۹۸۱ء میں میموریل لیکچر دیا تھا۔ اس موقع پر کمیٹی کی جانب سے ہم نے ایک پمفلٹ بانٹا تھا۔ ایک کاپی منسلک ہے۔ بنے بھائی اور فیض کی آخری تصویر کے علاوہ "جام الوداعی" بھی ہے جس پر فیض کے دستخط ہیں۔

"روشنائی" چند ماہ بعد چھپ جائے گی۔ راج بہادر گوڑ کا دیباچہ ہے اور ضخامت پانچ سو صفحے ہے۔ اس کی قیمت ساٹھ روپے رہے گی۔

علی باقر

سجاد ظہیر میموریل کمیٹی ۱۹ دکشنا پورم
جواہر لال نہرو یونیورسٹی — نئی دہلی

• • •

مریخ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ آپ کو دفتر سے بھی اشتہار و خط بھیجا گیا ہے۔ میں اس کی تجدید کے لئے زحمت دے رہا ہوں۔ ادب کے علاوہ دیگر علوم پر مضامین درکار ہیں۔

"چنگاری" اکثر دیکھتا اور پڑھتا رہا ہوں۔ اس پندرہ روزہ میں تنوع کے امکانات موجود و روشن ہیں۔ "غزل نمبر" کی اشاعت ہونے والی ہے۔ اصل یہ ہے کہ غزل لکھنے والے بہت ہیں لیکن غزل کی توسیع کرنے والے شعراء بس چند ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ غزل نمبر بھی اور نمبر کی طرح ادب کی قدر اوّل کا ترجمان نہ ہو سکے۔ بہرحال اب تو اشاعت کے بعد ہی فیصلہ ہو سکے گا۔

شکیب ایاز

• • •

ابھی تک کوئی بھی ایسا ادبی رسالہ نظر سے نہیں گذرا جس کا مطالعہ شروع سے آخر تک بغور کیا جائے۔ لیکن چنگاری کا ہر ایک شمارہ اپنے آپ سے باندھ لیتا ہے۔

اگر اسے مبالغہ خیال نہ فرمائیں تو لکھوں کہ چنگاری کے سرورق کے توسل سے جو مغل آرٹ کے نمونے آپ پیش کر رہی ہیں وہ بھی اپنے آپ ہی ایک رکارڈ ہے

عشرت صدیقی

• • •

"غزل نمبر" کی اشاعت کا اعلان بہت حوصلہ افزا ہے۔ یقین ہے اس میں نامور شعراء کے پہلو بہ پہلو نسبتاً کم معروف نئے شعراء کو بھی صحیح نمائندگی ملے گی اور سوانحی خاکوں کے علاوہ ان کی غزل گوئی پر مختصر مضامین شامل ہوں گے، جیسا کہ اعلان میں کہا گیا ہے۔ خدا کرے آپ کی کاوشیں بار آور ہوں اور چنگاری کا غزل نمبر ہر لحاظ سے آپ اپنی مثال ہو!

جنید حزیں لاری

• • •

یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس قحط الرجال کے دور میں لوگ اتنا اچھا اور سستا پرچہ نکال لینے کی کیسے ہمت کرتے ہیں۔

آپ کے برہنہ حروف نے واقعی سوسائٹی میں چھپے ہوئے کوڑھ کو برہنہ کر دیا ہے۔ ممتاز مفتی صاحب نے اپنے افسانہ "مانا نمانہ" میں قاری کے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ لندن کی ایک رات پر ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی صاحب کا تبصرہ بڑا پھیکا معلوم ہوا۔

انیس احمد خاں صاحب نے موجودہ دور میں تعلیمی معیار اور اساتذہ کرام کی چاپلوسیوں کو اچھی طرح اُجاگر کیا ہے

ظفر اللہ صادق

• • •

چنگاری کے کئی شمارے خرید کر پڑھ چکا ہوں۔ پرچہ کے متعلق اتنا عرض کروں گا کہ واقعی آپ کا عزم مصمم قابل ستائش ہے۔ جسے پورا کرنے کے لئے آپ کے پاس حسن سلیقہ بھی ہے۔ ساتھ ہی ایک اچھا معیاری اور صحت مند ادب کا ترجمان بنانے کے لئے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

سلطان احمد ساحل

• • •
• • •

قرۃ العین حیدر

ہم کیا ہماری شخصیت کیا

شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ،
"موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں پھولوں اور قوسِ قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے الفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے کمروں کا رنگ ہلکا ہے۔ پردے چھینٹ۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے پڑے لٹکتے ہیں۔"

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخوں خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی "شخصیت نگاریاں" اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

ہم نہایت ذوق و شوق سے رسالہ "شمع" بھی پڑھتے ہیں، اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہو کر مسلسل ایک چنڈو خانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے ماشاءاللہ ایک کمرے میں ریڈیو دھاڑ رہا ہے۔ دوسرے میں ایک بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں "چوہے دوڑ بلی آئی" کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ اللہ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایر فورس میں فلائیٹ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں مگر ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دنیا بھر کی فضولیات اور خرافات سے سخت دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، ہندو فنونِ لطیفہ سے شدید اُنس ہے اور کومکس کی تو آپ عاشق ہیں۔ ٹیل لاؤ اور ٹام اینڈ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں جب کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ سب گپ ماری ہے) ایک روز ہم حسب معمول گھاس پر بیٹھے (رات کے بارہ کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شنکر کو کیدارا میں منتقل کرنے میں۔ مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے، اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریز۔ مصنف نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گذری ہے۔ کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن واقعتہً بڑا زبردست انقلاب آچکا ہے اور بہرصورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاجی جس فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی "خصوصیات" ابھی زیادہ لوگوں کے پلے نہیں پڑتیں (یہ انکشاف بھی اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اٹھ کر کینیڈا چلا گیا۔)

میری بہت عزیز تر سہیلیاں جو مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں نے بہت بچپنے سے لے کر ۱۹۴۷ء تک عمر کا ایک ایک لمحہ اکٹھے بتایا تھا۔ ہندوستان میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی ایک بہت بڑی فوج بھی تقریباً ساری کی ساری وطنِ مرحوم ہی میں رہ گئیں۔

سہیلیوں سے قطعِ نظر ہم سب ماشاءاللہ سے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں۔ سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچتا ہے) ان کے علاوہ خدا نظرِ بد سے بچائے، ان سب میں جو ہمارا اپنا ایک گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ الموڑے میں ہمارے منجھلے چچا جان کا مکان "بیکٹ ہاؤس" تھا گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہجہان پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گزرتی تھی ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹری پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹری سے اترے گی بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہو گیا ہوتا۔ غالباً سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہوئے تو اے لیجئے۔ ایک سے ایک عالم، فاضل چلا آ رہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ دھڑا دھڑ توڑ ڈالے۔ ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں، ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بعضے بڑے سیاست دان بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ "قبیلے کا احساس" ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً وہی تربیت اور وہ مخصوص تہذیبی پس منظر ہے جس کا ذکر میں نے بلدرم کے متعلق مضمون میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دور دور تک تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے۔ بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے۔ بھانت

بھانت کی مصروفیتیں رہیں۔ بچپن رنگا رنگ مناظر سے پر رہا۔ اتر پردیش کے ہرے ہرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی، کلکتہ جنوبی ہند کی بندرگاہیں، ایران کے ساحل، کربلائے معلی، قاہرہ، ترکی۔ مستقل ادھر سے ادھر گھوم رہے ہیں۔

پہلی کہانی بمر چھ سال لکھی (ہاں صاحب! کیا بات ہے، ہونہار بروا ہے) کہانی کچھ یوں تھی کہ "کاٹھ گدام کا اسٹیشن تھا، رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹینیں لیے ادھر ادھر دوڑ رہے پھرتے تھے۔ جگنو کی قطاروں کی طرح ٹرین آتی دکھائی پڑی"۔ وغیرہ وغیرہ ماشاء اللہ کس قدر شاعرانہ تخیل تھا غور کیجئے کہ جگنوؤں کی قطاریں

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں۔ ان کے لیے باقاعدہ اسکول کھولا گیا تھا۔ ایک جرمن ہیلی نے بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی بیلنڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ جچا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی۔ اس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہر حال میرا گڈا خالص جرمن ہے۔ سیدھا برلن سے آ رہا ہے۔ تمہاری "لیڈی بیلنڈا" بلونڈ ہے مگر تمہاری گڑیا ہے لہٰذا ہندوستانی ہے۔ اسقدر غصہ آیا کہ برات واپس ہو شادی گئی عرصے تک شدید اینٹی جرمن جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو۔ فساد کرانے میں بڑا لطف آتا تھا بیک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرا دی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی اہم مقام حاصل تھا۔

اب یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ اسی مستقل ہنگاموں کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ کالج کے رسالوں کے لئے لکھتے تھے، وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکٹوٹی ہوئی جسے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی انگریزی میں کہہ گیا ہے۔

LITERARY SINO HAVE LONG SHADOWS

یہ بہت ہی حسب حال مقولہ ہے یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ سن رہے ہیں۔

ایک خاتون ہماری ایک کتاب کی ورق گردانی کر کے نہایت اطمینان سے بولیں۔ آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!!۔ اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ "میرے بھی صنم خانے" میں سوائے پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اے لیجئے۔ یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلمبند کی تھی۔ کرشن چندر صاحب نے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ کیا کیا جائے۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بر خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے۔ جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کی موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساس برتری کا شکار ہیں یا احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے COMPLEX میں گھرا ہوا ہے NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں ان لوگوں کو بہت قابل قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری "شخصیت" تو بھئی یہ تو ایک بڑا جدید قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری شخصیت — یہ کیا مسخرہ پن ہے۔

ہمارے ادارے کی چار تازہ

مطبوعات

۱۔ کالم نگار نمبر۔ — فکر تونسوی

۲۔ عالم اسلام۔ — اصغر علی انجینیر

۳۔ صبح کتنی خوبصورت ہے۔ (پنجابی افسانے) — جی، ایس، بھلر

۴۔ آسمانی خطوط۔ — ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

عصری آگہی ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

قرۃ العین حیدر۔ شمس الرحمان فاروقی

تخلیق بہ مقابل تنقید

شمس الرحمٰن فاروقی

پہلا سوال

آپ کی تخلیق پر کوئی نقاد اظہار خیال کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ نقاد سے کیا توقع کریں گے؟

(الف) نقاد آپ کی تخلیق پر فیصلہ جاتی انداز میں اظہار رائے کرے، یعنی یہ بتائے کہ تخلیق اچھی ہے یا بری ہے اور اچھی یا بری ہونے کی وجہ بھی بیان کرے۔

(ب) نقاد آپ کی تخلیق کی تشریح و تفسیر کرے۔ تخلیق کے اچھی یا بری ہونے کا فیصلہ اس قاری کا ہو جو آپ کی تخلیق کو نقاد کی تشریح و تفسیر کی روشنی میں پڑھتا ہے۔

(ج) نقاد آپ کی تخلیق کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرے۔ وہ تخلیق پر نہ تو فیصلہ صادر کرے اور نہ اس کے معانی و مفاہیم کی تشریح کرے بلکہ وہ محض اس ذہنی کیفیت اور جذباتی ردعمل کا بیان کرے جو اس تخلیق کے ذریعے اس کے اوپر مرتب ہوئے ہوں۔

(د) نقاد فیصلہ دے، نہ تشریح کرے، نہ اپنے تاثرات بیان کرے، بلکہ آپ کی تخلیق کا سچا اور ایمان دارانہ بیان تحریر کرے۔

پہلے طریقہ کار کو EVALUATIVE دوسرے کو INTERPRETIVE، تیسرے کو APPRECIATIVE اور چوتھے کو DESCRIPTIVE کہا جا سکتا ہے۔

... آپ کے خیال میں آپ کے نقاد کا صحیح منصب ان چاروں میں سے کس طرح کی تنقید لکھنے کا ہے۔؟

دوسرا سوال

کیا آپ اپنے نقاد کے لئے یہ مناسب سمجھیں گے کہ وہ آپ کی تخلیق میں ایسے معانی و مفاہیم تلاش کرے جو آپ کے عندیے (INTENTION) میں نہ ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے بھی کہ نقاد آپ کے عندیے تک بلاشک و شبہ پہنچ سکے۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ کے نزدیک علامت اور استعارے کا تفاعل کیا ہے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے کہ علامت اور استعارہ معانی کو روشن یا وسیع تو کرتے ہیں لیکن فنکار کے عندیے کو مبہم بھی کر دیتے ہیں۔

تیسرا سوال

کیا آپ کا نقاد اس بات میں حق بجانب ہوگا کہ وہ آپ کی تخلیق پر اظہار خیال کرتے وقت آپ کی ذاتی زندگی کے واقعات اور آپ کی ذاتی رایوں اور پسند اور ناپسند کو بھی اپنے فیصلے یا تجربے یا تاثر یا بیان کی دلیل میں لائے۔؟

چوتھا سوال

اگر فیصلہ کرنا نقاد کا کام نہیں ہے تو کیا یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ فن پارے کے بارے میں جو بھی اظہار خیال کیا جائے گا، اس میں کسی نہ کسی حد تک فیصلے کا عنصر بھی ہوگا۔ مثلاً یہی کہنا کہ "گودان کا مرکزی کردار ہوری ہے" فیصلہ جاتی بیان ہے۔ کیونکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ نے گودان کے تمام کرداروں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کرداروں میں ہوری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے یا مثلاً یہی کہنا کہ "اقبال کا مرثیہ داغ میر انیس کے مرثیوں کی طرح کا نہیں ہے" فیصلہ جاتی بیان ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مرثیوں کی قسمیں اپنے ذہن میں قائم کر چکے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی فیصلے تک پہنچنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ CATEGORIES قائم کی جائیں۔ لہٰذا اگر ایسا ہے تو آپ یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ تنقید کو فیصلہ جاتی ہونا چاہئے۔؟

پانچواں سوال

کیا نقاد کو اس بات کا حق ہے کہ وہ آپ کی تخلیق کو اس بنا پر مسترد کر دے کہ زندگی کے بارے میں جو رویہ یا کسی حقیقت کے بارے میں جو نظریہ آپ کی تخلیق میں ملتا ہے نقاد اس رویے یا نظریہ کو غلط سمجھتا ہے۔؟

قرۃ العین حیدر

پہلا جواب

نقاد اگر سمجھ دار اور محنتی ہے تو وہ چاروں طریقے استعمال کرے گا۔ لیکن (الف) کے علاوہ کیا باقی تین طریقوں میں سچائی اور ایمان داری نہیں برتی جاتی۔ معاف کیجئے گا آپ کے سوالات نظریاتی اور ٹکنکل قسم کے ہیں اور یہ دنیا کی کسی بھی زبان کے ادیب سے کئے جا سکتے ہیں۔ میں اردو میں لکھتی ہوں اور آپ بھی اسی زبان کے نقاد ہیں لہٰذا میں لامحالہ آپ کے سوالات کے جواب اپنے تجربے اور اردو کے ادبی ماحول کی روشنی ہی میں دوں گی۔

آپ نے ان چار طریقوں کے علاوہ پانچویں کا ذکر نہیں کیا جسے مصلحتی تنقید کہا جا سکتا ہے اور جو ذاتی تعلقات، ذاتی پرخاش ادبی سیاست اور دیگر اغراض و مقاصد کی بنا پر لکھی جاتی ہے اور اردو میں کافی رائج ہے اس نوجوان ادیب اور شاعر کا حالیہ واقعہ عبرت پکڑنے کے لئے کافی ہے کہ جب وہ مالی لحاظ سے صفر تھا تو اس کی تخلیقات پر کسی نے کچھ نہ لکھا مگر جب وہ کروڑ پتی وغیرہ بنا تو اسے ایلیٹ اور حافظ اور مولانا روم سے برتر ثابت کیا گیا (اس کے متعلق ایک قصیدہ شب خون میں بھی چھپا تھا)۔ یا اگر یہ طے کر لیا جائے کہ فلاں افسانہ نگار کو PROMOTE

کرنا ہے تو اس کے ایک بیحد معمولی افسانے کے پانچ پانچ "تجزیاتی مطالعے" ایک ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ مثال کے طور پر یہاں بانو قدسیہ جیسی غیر معمولی اور بلند پایہ افسانہ نگار کا کہیں نام تک نہیں لیا جاتا۔ (یہ میرا فیصلہ جاتی بیان ہے) یا مثلاً میں ایک کتاب لکھتی ہوں ایک مشہور نقاد جو ایک رسالہ بھی شائع کرتے ہیں ایک اور مشہور نقاد سے اُس کے خلاف طویل مضمون لکھواتے ہیں تاکہ ان کا چرچا ہو۔ CONTROVERSE کی صورت نکلے اور ان کا رسالہ زیادہ بکے۔

اس صورت حال میں دانشور نقادوں کی CREDIBLITY ایک ادیب یا ایک عام قاری کے لیے کتنی رہ گئی ہے۔ اور اس صورت حال میں آپ کے سوالات ذرا غیر ضروری سے معلوم ہو رہے ہیں۔

دوسرا جواب

آجکل ایک جناتی قسم کی تنقید لکھی جارہی ہے (مثال:۔ مہدی جعفر) جس میں (الف) کچھ پلے نہیں پڑتا ہے کہ مضمون نگار کہنا کیا چاہتا ہے (ب) ایسے مفاہیم تلاش کر لیے جاتے ہیں جو لکھنے والے کے عندیے میں نہیں تھے اور نہ کسی علامت اور استعارے سے اس کا اشارہ ملتا تھا۔ ایک بار مہدی صاحب نے شاید "ایک باپ بکاؤ ہے" کے لئے مجھ سے کہا تھا کہ یار لوگوں نے اس میں اسطوری اور جانے کیا کیا نکتے ڈھونڈ نکالے ہیں جو ان کے ذہن میں نہیں تھے۔

اس کے برعکس میرا ذاتی مسئلہ یہ ہے کہ سوائے "آگ کا دریا" کے (جس کی بال کی کھال نکالی جا چکی ہے) میری تحریروں کے استعارے، علائم اور تلمیحات کو اکثر نقادوں نے قطعاً نظر انداز کیا ہے یا غلط مطالب اخذ کئے ہیں۔ مثلاً مراد آباد کے فساد کے متعلق افسانے "دریں گرد سوارے باشد" ایک خاصے مشہور ناقد کو مسلمانوں کی نئی زر پرستی کے متعلق افسانہ نظر آیا۔

ظاہر ہے کہ علامت و استعارے کا تفاعل وہی ہے جو ہونا چاہئے۔ آجکل یا بیحد متبذلانہ اور OBUIOUS قسم کے علامتی افسانے لکھے جارہے ہیں یا بیحد مبہم۔ استعارہ اتنا مبہم نہ ہونا چاہئے کہ بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ ورنہ ایک SANE تخلیق اور پاگلوں کی لکھی ہوئی تحریروں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ مغرب کے پاگل خانے اپنے ذہنی مریضوں کے لکھے ہوئے افسانے نظمیں اور ان کی بنائی ہوئی تصویریں شایع کرتے ہیں جو اکثر نہایت فکر انگیز اور مضطرب کرنے والی ہوتی ہیں۔ مگر وہ صحیح الدماغی کا ادب یا آرٹ نہیں۔

ذاتی طور پر میں ضرور ایک صاحب نظر نقاد سے یہ توقع رکھوں گی کہ وہ میری SECRET LANGUAGE کو سمجھ لے اور اس کی تفسیر و تشریح کر سکے۔ لیکن جب تخلیق کار اور ناقد کے درمیان ہی کمیونی کیشن نہیں تو یہ قصور کس کا ہے۔؟ ناقد کو بلاشک و شبہ میرے عندیے تک پہنچنا چاہئے۔ اگر وہ نہ سمجھ سکے تو اس کا برملا اظہار ہونا چاہئے۔ بغیر سمجھے بوجھے اپنی رائے دینا میرے نزدیک نقاد کا صحیح منصب نہیں ہے۔ علامت اور استعارے معانی کی توسیع ضرور کرتے ہیں لیکن فنکار کے عندیے کو مبہم اس وقت کرتے ہیں جب فنکار چاہے کہ فنی یا کسی اور مقصد سے وہ عندیہ مبہم رہے مجھ سے اکثر طنزاً کہا جاتا ہے کہ آپ کی تحریروں پر لکھنے کے لئے تو بہت سے علوم سے واقف ہونا چاہئے۔ یہ بالکل مہمل بات ہے اگر ناقدین نے اپنے آپ کو ادب کا پارکھ مان کر اپنی گدیاں سنبھالی ہیں تو یقیناً ان کو بہت سی پوتھیاں باچنی چاہئیں۔ ادب اکہری چیز نہیں ہے۔

فن کار چاہتا تو ہے کہ علایم کے ذریعے معانی روشن ہوں اور وہ دھندلے ہو جاتے ہیں تو یہ لکھنے والے کی اپنی کمزوری ہے۔ بڑے فنکاروں کا ابہام ان کی طاقت ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا ہر قاری تاریخ انگلستان یا اینگلو کیتھولک چرچ کی LITURGY سے واقف نہیں یا ایٹس کو آئرش اساطیر جانے بغیر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ یعنی اس کے الفاظ کے ظاہری، یونیورسل، اندرونی معانی بھی گرفت میں آسکتے ہیں۔ لیکن ابہام برائے ابہام جو پچھلے دنوں اردو میں رائج تھا لا یعنی ہے۔

تیسرا جواب

تنقید لکھتے وقت فنکار کی ذاتی زندگی رائیں، پسند ناپسند وغیرہ کے متعلق CONTENT شعوری یا غیر شعوری طور پر نقاد کے ذہن میں عموماً پہلے سے موجود رہتا ہے۔ بالکل نئے لکھنے والوں کے علاوہ مشہور اہل قلم کے متعلق سب کو اتنا معلوم رہتا ہے کہ اس کا اثر ناقد کی رائے پر پڑنا ناگزیر ہے۔ میں نے آجتک میراجی کے متعلق کوئی مضمون ایسا نہیں پڑھا جس میں اس شاعر کی ابنارمل نفسیات کو زیر بحث نہ لایا گیا ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ ژاں ژینے کی طرح میراجی اپنی ابنارملٹی کو (CELEEB RATE) کرتے تھے۔ مگر مجاز، منٹو، ناصر کاظمی کی جو ہمیں زندگیاں اور ان کی شراب نوشی یا کرشن چندر و فیض کی اشتراکیت سے وابستگی ان پر تنقید کے فریم ورک میں ہمیشہ شامل رہتی ہیں۔ انتظار حسین اور ان کی "ہجرت" کی MISTIQUE لازم و ملزوم ہو چکے ہیں جب کوئی "خوشبوؤں کے باغ" پر لکھنے بیٹھا ہے تو اسے پہلے سے معلوم ہے کہ انور سجاد ایک سیاسی آدمی ہے اور اس نے ایک سیاسی استعاراتی ناول لکھا ہے۔ آپکے STAINE کی مجبوری بھی تو یہی تھی کہ فنکار کی زندگی اس کی نسل قومیت سماجی پس منظر وغیرہ وغیرہ نقاد کے پیش نظر رہنا چاہئے۔ اردو میں خواتین کا معاملہ گویا ایک اور جہت کا اضافہ کرتا ہے ہمارے فکشن پر بڑی حد تک خواتین غالب ہیں۔ تنقید مردوں کا اجارہ رہی ہے (سوائے ایک خاتون ممتاز شیریں مرحومہ کے) ناقدین

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

فتح محمد ملک

قرۃ العین — اپنی تلاش میں

قرۃ العین حیدر کے ہاں تلاشِ ذات کے سفر کے موجودہ مرحلے کا خیال کرتا ہوں تو اقبال یاد آتے ہیں۔ اس تلازمِ خیال پر غور کرتا ہوں تو اقبال اور قرۃ العین کے کارنامۂ فن میں چند در چند مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ اقبال ہی کے مانند قرۃ العین بھی آتشِ رفتہ کے سراغ میں ہیں اور ان کی ساری سرگزشت بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے۔ اقبال نے ہماری شاعری کو فلسفیانہ رنگ و آہنگ بخشا تو قرۃ العین نے ہماری فکشن کو گہرے فلسفیانہ انداز میں سوچنا سکھایا۔ دونوں کی تخلیقی بے چینی کا سرچشمہ ایک ہے۔ دونوں کا سوز و سازِ آرزو ہندی مسلمانوں کے اجتماعی مقدر پر غور و فکر سے پھوٹتا ہے اور دونوں کے ہاں یہ موضوع بالآخر وقت اور تاریخ کی ماہیت و معنویت پر فکری و تہذیبی مراقبہ بن گیا ہے۔ پھر ہر دو مفکر فن کار ہم نصیب بھی ہیں۔ اقبال عمر بھر جس فکری تنہائی اور روحانی اضطراب سے دوچار رہے، فکری اجنبیت اور روحانی جلاوطنی کا وہی احساس قرۃ العین کا مقدر رہا ہے:

"دور سے جبل الطارق نظر آیا۔ اماں بہت مضطرب ہو کر کھڑکی سے لگی اس چٹان کو دیکھا کیں اور اقبال کے اشعار دہراتی رہیں۔ اس پوری نسل کو اقبال اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تجدید کے جذبے اور اپنے ماضی کے ورثے اور اس کی المناک گمشدگی کا بڑا شدید احساس تھا حالانکہ ان لوگوں نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ دورِ حاضر کی کوئی لڑکی میرے خیال میں جبل الطارق کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگی۔ شاید اسے اس چٹان کی معنویت کا علم نہ ہو۔"[۱]

قرۃ العین عہدِ حاضر کی شخصیت ہیں لیکن انہیں جبل الطارق کی تہ در تہ تاریخی اور جذباتی معنویت کا احساس ہے۔ یہی احساس انہیں اپنے معاصرین میں ایک یگانۂ روزگار ہستی بھی بناتا ہے اور فکری تنہائی اور تہذیبی بے چارگی سے بھی دوچار کرتا ہے۔ جس زمانے میں قرۃ العین حیدر نے شعور کی آنکھ کھولی وہ زمانہ ہماری ادبی دنیا میں نئے اور ترقی پسند ادب کے فروغ کا زمانہ ہے۔ اپنی تہذیبی اور ادبی روایات کا باغی ادیب فقط حاضر و موجود کی اسیری پر نازاں ہے۔ اقبال کے طرزِ فکر و احساس سے بغاوت اور آبائی چلن سے انحراف جدت پرستی اور ترقی پسندی کا لازمہ ہے۔ ایسے میں قرۃ العین اپنے والدین سے کسی نفسیاتی پرخاش یا فکری عناد کو پروان چڑھانے کی بجائے ان سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں جن روایات اور اقدار سے ان کی زندگیاں عبارت تھیں۔ انھیں سینے سے لگاتی ہیں۔ ان کی شخصیتوں میں انھیں نور ہی نور، رنگ ہی رنگ نظر آتا ہے۔ جس باشعور محبت کے ساتھ انھوں نے اپنے عظیم باپ کی شخصیت[۲] اور محمد علی ردولوی کے فن[۳] پر قلم اُٹھایا ہے وہ جدید ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب اپنی تاریخ اور تہذیب کو رد کرنا ایک غالب ادبی رجحان تھا۔ اُس زمانے میں انھوں نے اپنے مخصوص تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے حسن و قوت کو اُجاگر کیا اور اس بات پر غور و فکر ترک نہ کیا کہ اُن کے ابا اماں وقت بے وقت اقبال کے اشعار کیوں گنگناتے رہتے تھے؟ یہ اسی غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ مادی ہمہ اوست کے عہد میں اُنھوں نے برملا اعلان کیا کہ:

۱؎ کارِ جہاں دراز ہے
۲؎ سید سجاد حیدر یلدرم مطبوعہ نقوش، شخصیات نمبر حصہ اول
۳؎ رودِ نیمز
۴؎ داستان طراز، مطبوعہ سویرا لاہور ۱۵، ۱۶

"لکھنا ایک مابعدالطبیعاتی فعل ہے۔ اس طرح لکھنا جیسے صفحے پر بارش ہو رہی ہو، ادراک، اکتساب، تجزیہ، تشریح، ترجمانی، اطلاع، خبر رسانی، یہ سب ایک عمل میں شامل ہے...... کوئی ایک معمولی سا واقعہ اور آپ ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

تین چار سال ہوئے آپا نے مشین پر سلائی کرتے ہوئے یوں ہی باتوں باتوں میں کہا "اپنے قصبے میں جاڑے آتے ہی ہم ہار سنگھار سے دوپٹے رنگتے تھے اور جب بسنت آتی تھی ——"

ان کی بچی نے جو چار سال کی عمر سے کراچی میں رہ رہی ہے ایلوس پریسلے کی سوانح حیات پر سے سر اُٹھا کر پوچھا "اماں بسنت کیا ہوتی ہے؟"

اس ایک جملے کو سننے کے بعد میں نے آٹھ سو صفحات کا ناول لکھ مارا۔ "اماں! بسنت کیا ہوتی ہے؟"

ساری دنیا، ساری کائنات کا تجزیہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر تلاش کسی ایک نقطے سے تو شروع کی جا سکتی ہے۔"[ل]

بسنت کی تلاش میں قرۃ العین "آگ کا دریا" عبور کر کے اپنے آبائی قصبے میں پہنچیں تو وہاں اور ہی نقشہ پایا۔ اب یہاں نہ وہ بسنت تھی نہ وہ بستی نہ وہ لوگ۔ "آگ کا دریا" کے آخری باب میں جب کمال رضا، ہری شنکر اور گوتم نیلمبر سے ملے بغیر پاکستان لوٹ آتا ہے تو وہ دونوں اکٹھے سوچنے لگتے ہیں کہ:

"ابوالمنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا؟[ل٢] ——"

—— بسنت کیسے ہندوستان میں نمودار ہوئی تھی اور کیوں کر غائب ہو گئی؟ —— نہٹور کی بستی کیسے بستے بستے بسی تھی اور کس طرح آن کی آن میں تاراج ہو گئی ہے —— یہاں سے قرۃ العین کے ہاں تلاش کا وہ نیا سفر شروع ہوا جس کے احوال و مقامات اور واقعات و مشاہدات "کارِ جہاں دراز ہے" میں جلوہ گر ہیں۔

"کارِ جہاں دراز ہے" کی شانِ نزول حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تجدیدی کارناموں کے نقطۂ آغاز کی یاد دلاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے خواب میں اشارہ پا کر "حجۃ اللہ البالغہ" لکھنا شروع کی تھی اور قرۃ العین نے نہٹور کے ویران آبائی مکانات کے کھنڈرات میں ہاتف کی صدائے "برخیز و بنگر" سن کر کوفہ سے کوفہ تک صدیوں پر پھیلے ہوئے سفر کا عزم باندھا اور جب بارہ سو سال تک مختلف زمانوں اور زمینوں میں سرگرداں رہنے کے بعد منزل پر پہنچیں تو انجام میں آغاز کا منظر دیکھا:

"میں دشتِ لوط کے کنارے کھڑا ہوں۔ کس طرف جاؤں؟ موت کہیں بھی کسی راستے سے آ سکتی ہے چمکیلے خنجر کا وار، زہر کا بلوریں پیالہ، زنداں کے دروازے پر جلاد کی دستک۔"

یوں قرۃ العین اپنی جڑوں اور "حقیقت کی دوسری جہات اور تہوں کی تلاش کے لئے" دل کی "مشعل جلا کر وقت کی اندرونی ہفت خواں" طے کرتے کرتے ۱۲۲ھ کے دمشق میں امام زید بن زین العابدینؓ تک جا پہنچتی ہیں۔ اقبال قرۃ العین کے خون میں بولنے لگتا ہے اور عہد در عہد صدیاں پھر سے زندہ ہو کر ان کے کانوں میں ایسا طلسم پھونکتی ہیں کہ ہر واقعہ سراسر حیرت اور تنبیہ الغافلین نظر آتا ہے اور اپنی تمام تر جلا وطنیوں اور ہجرتوں کا سبب اسلام پر ملوکیت کے غلبے میں دیکھتی ہیں:

"اللہ کی دنیا بڑی عجیب و غریب ہے۔ کون کون کدھر نکل گیا کیسی کیسی اجنبی اقوام کے درمیان جا بسے۔ آگے کیا ہوگا۔ ڈر لگتا ہے۔ فتح توران کو عرصہ ہو چکا۔ بخارا، سمرقند اور ترمذ میں عرب نو آبادیات قائم ہیں۔ دمشق و بغداد سے بہت دور ماوراء النہر میں شاید امن نصیب ہو۔ ایک وقت تھا کہ ہم آل حسنؑ و حسینؑ مدینہ میں خاموشی سے رہتے تھے مگر خدا کی قسم منصور کے جاسوسوں نے ہماری زندگیاں تلخ کر دیں۔

[ل] کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے۔ مطبوعہ نقوش لاہور دسمبر ۱۹۵۹ء

[ل٢] صفحہ ۸۴۷

کہا جاتا ہے کہ اہلِ ایران شہزادی شہر بانو کی وجہ سے ہم سے محبت کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ سیاسی معاملات زیادہ پیچیدہ اور نازک ہیں۔ میری سمجھ میں کبھی نہ آئے۔

بلخ کے آتش کدے سرد ہو چکے۔ امیر سامان نے کلمہ پڑھ لیا۔ دیلم کے کریم بن شہریار نے کلمہ پڑھ لیا مگر ساسانیت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ حاکموں نے بادشاہت کے آداب اختیار کر لئے۔ سامان کے لڑکوں کو حکومتیں بخشی گئیں۔ نوح سمرقند، احمد فرغنہ، الیاس ہرات۔ سب نے اپنا شجرۂ نسب بہرام چوبیں سے جوڑا۔ سارے حاکم خود کو خسرو اور دارا کہلوا کر خوش ہو رہے ہیں۔ بخارا اور سمرقند گھوم کر آؤ تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کیسی بدلی ہے۔ سامانی دربار میں رودکی قصیدے پڑھتا ہے،

شاہ ماہ است و بخارا آسماں　　　　شاہ سرو است و بخارا بوستاں

ہائے ابوذر غفاریؓ

ملک گیری، کشور کشائی اور ملوکیت کے معاملات عبرت ناک ہیں ......،،

——ملوکیت کے معاملات عبرت ناک ہیں چنانچہ کلمہ گو شہنشاہوں کے قیصر و کسریٰ سے مستعار آئینِ جہانداری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں پر ظلم و ستم کے وہ وہ پہاڑ توڑے گئے کہ لوگ دار و گیر کے خوف سے جنگلوں اور ویرانوں کو نکل گئے اور!

"یہ جو بعض اصحاب کا قول ہے کہ مذہب اسلام میں قطع علائق ممنوع ہے۔ اکابر صوفیا، راہبانِ مسیحی و اہل ہنود سے متاثر ہوئے۔ ہمارے نزدیک یہ نظریہ چنداں صحیح نہیں۔ کس واسطے کہ جب امتِ رسول کے حاکموں نے طور طریق شاہانِ عجم کے اختیار کیے۔ خود کو بصد ناز خسرو و دارا کہلوایا، وہ اور اُن کے حاشیہ بردار مظالم غربا پر کرتے تھے۔ تب ائمہ و اولیا نے اقتدار پرستی کے خلاف ایک تحریک گویا شروع کی اور ہم جو ائمہ اور صوفیا کی نسل سے ہیں ارکانِ دولت میں شامل ہو کر داخل طبقہ امرا میں ہوئے۔ لبادے کارچوبی طلائے مغرق زیب تن کرتے تھے۔ ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے۔ شیخینؓ اور اویس قرنیؓ اور ابوذر غفاریؓ کو بھولے تھے اور یہ سراسر فراموش کر چکے تھے کہ ملوکیت و شہنشاہیت کے معاملات عبرتناک ہیں"۔

——شہنشاہیت کے معاملات عبرتناک ہیں۔ سو، امام زین العابدینؒ کی اولاد میں سے ایک صوفی بزرگ غریب الوطنی کو شہنشاہیت کے ساتھ سمجھوتہ بازی پر ترجیح دیتے ہیں اور یوں سید کمال الدین ترمذیؒ "کفار کو دین مبینؐ کی راہ پر ڈالنے کے عزم سے" اپنے بی بی بچوں کے ساتھ "ہندوستان" ہجرت کرتے ہیں "کارِ جہاں دراز ہے" سید کمال الدین ترمذی کی اولاد کی بارھویں صدی عیسوی کے ربع آخر سے لے کر بیسویں صدی کے ربع آخر تک پھیلی ہوئی نسل در نسل مادی اور روحانی سرگزشت ہے۔ دس برس کی دلسوزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ قلم بند ہونے والی اس "طلسم ہوشربا" کو قرۃ العین نے سوانحی ناول کہا ہے مگر میں اسے اسلامیان ہند کی تہ در تہ اجتماعی شخصیت کا آئینہ سمجھتا ہوں۔ مسلمانوں کے برصغیر میں جڑ پکڑنے سے لیکر مرگ و بار لانے کے سماں تک اور پھر بیخ جڑ کی جبر و دستیوں سے دوچار ہو کر مانند ایک خوشبو کے دیس دیس ہجرت کی داستان اپنے تمامتر ابعاد کے ساتھ اس نادر و نایاب فن پارے میں جلوہ گر ہے۔

اسلامیانِ ہند دورِ سلطنت سے دورِ مغلیہ میں کیونکر داخل ہوئے ہیں، اس دورِ جاگیرداری کی فضا سے نکل کر ڈپٹی کلکٹروں کی سول لائینز میں خان بہادروں کا نیا طرزِ زیست کس ٹھاٹھ سے اپناتے ہیں اور پھر برطانوی سنگینوں کے زور سے قائم کی گئی جغرافیائی وحدت کے ٹوٹنے پر پاکستان بنگلہ دیش اور بھارت کی آزاد ریاستوں میں جبر و قدر کی گتھیاں سلجھانے میں کس طور سرگرداں نظر آتے ہیں —— آٹھ صدیوں پر پھیلی ہوئی یہ رزمیہ قرۃ العین نے جس آفاقی تناظر اور جس باشعور جنوں کے ساتھ بیان کی ہے وہ اقبال کے بعد آج تک کسی دوسرے فن کار کو نصیب نہ ہو سکا۔ بھرا اسالیب کا ایسا حیرت انگیز تنوع ہے کہ قصۂ قدیم و جدید و اقعتاً کم نظری کی دلیل معلوم ہوتا ہے اور پوری کتاب زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک——

کا جیتا جاگتا ثبوت بن جاتا ہے۔ راوی عہد بہ عہد اپنی شکل بدلتا ہوا قرونِ وسطیٰ کا سفرنامہ نگار، مؤرخ، صوفی تذکرہ نگار، درباری وقائع نویس، داستان گو، جدید ناول نویس، سیاسی کالم نگار اور اردو افسانہ نگار کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ خود قرۃ العین نے "حادثات و واقعات کے الاؤ کے سامنے" بیٹھے ہوئے اس "پیر جماندیدہ کا دوسرا نام وقت" بتایا ہے۔

وقت کہ تیغِ قاطع اور برہان ناطق ہے قرۃ العین کے ہاں عصرِ رواں سے زمانِ دائم اور زمانِ دائم سے عصرِ رواں بنتا نظر آتا ہے:

"یاد رہے کہ پچھلا وقت آج سے منسلک ہے۔ کوئی سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ ازل سے ابد تک وجود مبہم اور مسلسل اور مستقل ہے۔ ماضی کا ہر واقعہ ہم سے بہت نزدیک ہے۔ تاریخ کی مجموعیت اور تسلسل اور معنویت کا جس قدر شدید احساس ہم محمڈن لوگوں کو ہے۔ دنیا کی کسی قوم کو نہیں۔ ہر واقعہ اور حادثہ موجود ہے۔ ہم حال میں زندہ ہیں مگر ماضی میں اسی شدت کے ساتھ شامل ہیں۔ ہر زمانے میں ہم شریک رہے ہیں۔ بات مابعد الطبیعیات کی طرف چلی جائے گی ....."

بات اکثر مابعد الطبیعیات کی طرف نکل جاتی ہے خصوصاً جب قرۃ العین ماضی کی ہم عصریت اور حال میں ماضی کی کارفرمائی پر غور و فکر کرتے وقت مسلمانوں کے تصورِ زماں اور تصورِ تاریخ سے روشنی لے رہی ہوں۔ ایسے میں "تیرہ سو برس کی تاریخ کے بے بہا خزانے" اُن کے کرداروں کے "نسلی حافظے اور خون" میں کروٹیں لینے لگتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں سے:

"ہر فردِ بشر اپنے حاضرات الخیال، اپنا عالم رویا رکھتا ہے جس میں کوئی دوسرا شامل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ہم کسی دوسرے کی موت کی تکلیف نہیں چکھ سکتے کسی اور کے خواب ہمیں نظر نہیں آتے۔ ہر انسان کے دن رات، صبح شام لمحاتِ منفرد اور علیحدہ ہیں۔

عذابِ قبر۔ وہ سزائیں جو تم بھگتو گے۔ اس حس کے ذریعے سہو گے جو صرف تمہاری حس ہو گی اور جو زندگی میں تمہیں حاصل نہیں۔

اِس عالم سے اُس عالم تک خالص اذہان، فرشتے اور وحی اور الہام اور رویا بن کر آتے ہیں۔ سہروردیؒ نے کہا تھا یا ابن العربیؒ نے؟

ابھی ابھی جنکی ایک جماعت اِدھر سے گزری۔ سب کی صورتیں مختلف۔ رجال الغیب ہوا میں اُڑتے پھر رہے ہیں۔ اخیار و ابدال اور ابرار اور اوتار اور اقطاب کے گروہ آسمان پر چل رہے ہیں۔

سارا عالم قوس و قزح میں تبدیل ہو گیا ــــــ"

یہ واردات ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے باغی سپاہی میر احمد علی کی ہے جسے قرۃ العین نے "شخص نامعلوم" کے عرف کے ساتھ روحِ عصر قرار دیا ہے اسلامیانِ ہند کی رُوحِ حریت کا یہ استعارہ گاگن ندی کے خاموش پانیوں کے کنارے بیٹھا صیہوں کو یاد کر کر کے روتا ہے اور سوچتا ہے:

"ضیاء الدین صاحب پھر واپس آ گئے ہیں وہ کیا سامنے کھڑے ہیں۔ فلاسفہ کی کتابوں میں آیا ہے کہ ہمارے سارے اجداد ہمارے اندر زندہ ہیں۔ جسمانی اور مابعد الطبیعیاتی دونوں طرح۔

ہم خود اس وقت میر ضیاء الدین کی آنکھوں سے اس سرد ویرانے کو دیکھتے ہیں۔ ضیاء الدین کی آنکھیں اور ہماری آنکھیں ایک ہیں۔ ہمارے ہاتھ کسی اور نگڑ دادا کے ہاتھ ہیں۔ دماغ عقل، فہم یا نافہمی کسی اور پُرکھے کی عقل یا نافہمی ہے۔

خون ہزار ہا برس سے شریانوں میں گردش کر رہا ہے۔ تجدید الخلق۔ سوچ کر پھریری سی آ جاتی ہے۔ مولانا روم نے کیا فرمایا تھا۔ کچھ ضرور فرمایا تھا۔ یاد نہیں آ رہا۔ حافظہ کمزور ہو چلا ــــــ"

بے شک ہمارا حافظہ کمزور ہو چلا ہے۔ اقبال کے بعد تو ہمارا حافظہ کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہو چلا تھا کہ بعد ایک مدت کے قرۃ العین حیدر ہمارا اجتماعی حافظہ بن کر نمودار ہوئیں اور پتہ چلا کہ ہماری تہذیب میں مافوق الفطرت، فطرت کی توسیع ہے، ماورائے حقیقت، حقیقت کا جزوِ لاینفک ہے، عشق کی تقویم میں اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام اور یہ زمانے عصرِ رواں میں جاری و ساری بھی ہیں اور عصرِ رواں سے الگ تھلگ بھی ہیں:

"بارہویں اور بیسویں صدی کے درمیان وقفہ صرف ایک پل ایک آن کا ہے" (ہجوں سے جنا)

"آنسوؤں کا ذات تیرہ سو برس سے بہہ رہا ہے۔ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے غلامانِ اہلِ بیت اطہار اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں گویا واقعہ کربلا آج کی بات ہے" (امام باڑہ)

"چھ سو برس قبل ابن بطوطہ نے رپورٹ کیا تھا کہ کنارے فرات شہر دجلہ میں، مسجد کے دروازے پر حریر کا پردہ لٹکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مہدی قائم آلِ محمدؐ اسی مسجد میں داخل ہو کر مستور ہوئے۔ روز شام کو غروبِ آفتاب کے وقت شیعہ وہاں جمع ہو کر گریہ و بکا کرتے ہیں۔ اخرج یا صاحب الزماں۔ اخرج یا قائم المنتظر ——— رات گئے تک روتے چلاتے رہتے ہیں۔ حریر کا پردہ اسی طرح ساکت رہتا ہے۔ پھر وہ مایوس ہو کر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

مگر اے پاشاؤ، شریفو، آغاؤ، سیدو، خان بہادرو، آج سارا دار السلام سرنگوں ہے۔ سب مل کر پکارو۔ اخرج یا صاحب الزماں اخرج یا حجت اللہ، یا قائم المنتظر۔

خفیہ کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ جگہ جگہ چپکے چپکے میٹنگیں کی جا رہی ہیں۔ طہران، استانبول، قاہرہ، بغداد کے تہہ خانوں میں سازشیں ہو رہی ہیں۔ زمانہ نازک ہے اور دیکھو کل کی بات ہے جب بنی امیہ کے خلاف، بنی عباس کے خلاف، بنو فاطمہ کے خلاف کیا کیا خفیہ میٹنگیں نہ ہوئیں۔ یہی کوچہ و بازار، یہی دشت و صحرا، یہی انسان، ان کے اب وجد۔ آج شاہانِ قاچار اور آلِ عثمان اور خاندانِ رامنوف اور اولادِ وکٹوریہ کی باری ہے

طہران، استانبول، سینٹ پیٹرزبرگ، ماسکو، باکو لندن، پیرس، کلکتہ، ہر شہر میں سرپھرے لونڈے خفیہ مسکوٹ کر رہے ہیں۔ زمانہ خطرناک ہے۔

مستقبل کی محراب کا پردہ اسی طرح ساکت ہے اور نوجوان ایشیا اور افریقہ اس کے سامنے گڑگڑا چلا چلا کر پکار رہا ہے۔ اخرج یا صاحب الزماں۔ اخرج یا روحِ انقلاب" (باب عالی)

یہ بیسویں صدی کے آغاز کا ایک لمحہ ہے۔ آج بیسویں صدی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لمحہ دنیائے اسلام میں منجمد ہو کر رہ گیا ہے:

"مسلمان محض دعاؤں اور عظمتِ رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے۔ نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کربلائے معلّٰے، نجف اشرف اور مشہد ہر جگہ سے حسبِ معمول گریہ و زاری کا شور بلند ہو رہا ہے" (باب عالی)

اور سلاطین و ملوک:

"کا نازنینوں کی طرف حسبِ معمول کمال استغراق ہے اور صاحب لوگ مشنری لوگ، فوجی، سولین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سویز سے گزرتے ہوئے مراقش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیام لوٹنے میں مصروف ہیں۔ مشرق میں ہر سمت سوا جہالت، سوا پس ماندگی اور درماندگی، غلامی، ناداری، تباہی اور کیا نظر آتا ہے۔

السلام علیک یا بنتِ رسول اللہ" (باب عالی)

جمود و زوال اور تباہی و بربادی کا یہ لمحہ دنیائے اسلام میں اٹل ہو کر کیوں رہ گیا ہے؟ ——— قرۃ العین نے اس سوال پر جذباتیت اور

وقت کے بجائے ایک حقیقت شناس اور ترقی پسند شعور کے ساتھ تخلیقی مراقبہ کیا ہے اور اس عمل کے دوران خود کو اپنے مراعات یافتہ طبقے سے بخوبی الگ کیا ہے :

"ستمبر ۱۹۶۲ء ...... منی بس میں میرے برابر بیٹھے ہوئے کزن نے کہا: باجی یہ سارا علاقہ اپنا تھا! معلوم ہے۔ وہ خدایا! یہ زمیں، تیری نہیں تیری نہیں۔ تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں۔ یوپی اور سارے ہندوستان میں مسلم اہلِ حرفہ کا ایک متمول اور ترقی پذیر طبقہ پیدا ہو چکا ہے۔" (تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا)

"ہاہا خونداآئی برخیز! — نہٹور، لانگوی، محمود پور — اردوئے شاہجہانی کے ان تین گمنام، ویران خیموں کی روداد — بنگر! — فیوڈل سماج اپنے افراد کو DELUSIONS OF GRANDEUR میں مبتلا رکھ کر عمر طبعی کو پہنچ کر کس طور سے ختم کرتا ہے۔ کھول آنکھ! اور اسی محلہ سادات سہ دری میں صدیوں کے درماندہ بنکروں اور کاریگروں کی نئی خودداری اور خوش حالی کو ذرا دیکھ کہ یہ نئے سماجی انقلاب کی ایک خوش آیند علامت ہے۔ مغنی گجائی کے وقت گل ———

یہ انقلاب میں نے بات کاٹی، خاماشست خرام ہے اور ادھوری علامتیں کافی نہیں۔ مجھے چیزوں کی ابتدا جاننے کی ہمیشہ ٹوہ رہی۔ میر صاحب، خاں صاحب اور نواب صاحب رفعت پناہ کیوں تھے اور ناحق چوٹ جولاہا کیوں کھاتا تھا۔ وجہ معلوم ہے علاوہ ازیں خواجگی اب بھی موجود ہے!" (تعارف)

قرۃ العین حیدر مسلمانوں کی فکری اور تہذیبی تاریخ کو مسلمانوں کے امپیریل ماضی سے الگ کر کے دیکھتی ہیں۔ لکھنا ان کے لئے "ایک مابعد الطبیعیاتی فعل ہے"۔ اور اقبال کے مصرعے صفحۂ قرطاس پر بارش کی مانند گرتے ہیں[۱]۔ کچھ یہی صورت انبیاء، ائمہ اور صوفیا و اولیاء کے ملفوظات کی ہے۔ مسلمانوں کا زندہ ماضی اُن کے خون میں یوں گردش کر رہا ہے کہ "سری رنگا پٹنم" کا بورڈ دیکھ کر ہی دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا ہے"۔ اور دورانِ سفر بھکارن سے یہ گفتگو ہوتی ہے :

"کیا نام ہے؟"

"چاندنی بی!"

"بچے کا نام؟"

"حسین صاحب!"

"چاندنی بی، ٹیپو صاحب، حسین صاحب! —— صاحب یہ مابعد التواریخ ہے۔" (دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں)

برسوں پہلے "نقوش" کے شخصیات نمبر میں ابن سعید کے مضمون پر اپنے فٹ نوٹ میں قرۃ العین نے لکھا تھا :

"قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی نہیں ہوں۔"

اور جب سارے گھرانے کا احوال رقم کرنے بیٹھیں تو مابعد التواریخ کی خوابناک فضاؤں میں جا نکلیں۔ کائنات اور وقت کے باطن میں قرۃ العین حیدر کا سفر ہنوز جاری ہے۔ دیکھئے اگلی منزل کہاں ہو؟

---

[۱] مثال کے لئے دیکھئے باب بعنوان: یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ۔

معروضی تنقید

رفاد فتیحی

ہر زندہ نسل اپنی تنقید اپنے معیار اور پیمانے خود بناتی ہے۔ اسی سے توصیف کے پیمانے بنتے ہیں اور اسی سے گمنام ادیب اور ادبی ادوار دوبارہ اہمیت حاصل کرتے ہیں اور نامور ادیب اور ادوار گوشۂ گمنامی میں جا چھپتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہر دور اپنے پچھلے دور سے ذہنی سماجی تہذیبی و فکری اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی ضروریات۔ تقاضے اور عوامل جدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ادبی رجحانات اور انکے مطالعے کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ اگر ہم ادبی تنقید کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ ہر زمانے میں ادبی تنقید اس زمانے کے فلسفے یا سائنسی اصولوں سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر ہم یہ کہیں کہ ہر زمانے کا انداز فکر ہی اس زمانے کے ادبی تنقید کا دائرہ عمل متعین کرتا ہے تو شاید غلط نہ ہو۔ کبھی ادبی تنقید ادیب کے ذہن میں جھانکنے کی غرض سے نفسیاتی اصولوں کا سہارا لیتی ہے تو کسی دور میں ادب کے سماجی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے سماجیات کا دامن تھامتی ہے۔ تو کبھی ادب میں جمالیات کا تجزیہ کرنے کے لیے دیگر سائنسی علوم کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانے معیاروں پر ہمیشہ نظر ثانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاکہ نئے معیار نئی نسل کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کر سکیں بیسویں صدی میں سائنس کی ترقی اور کمپیوٹر کے عام استعمال کمیونیکیشن انجینئرنگ اور مشینی ترجموں نے ادبی مطالعوں میں تنقید نگاروں کو بھی سائنسی رنگ دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادب کے سائنسی مطالعے کے نام پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کا رشتہ سائنسی کے مختلف شاخوں کے کچھ شعبوں تک ہی محدود ہے۔ ان تنقیدی مطالعوں میں اس انداز فکر کی جھلک نہیں نمایاں ہو سکی جو سائنسی مطالعے کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو ایسا ہونا نہ صرف فطری بلکہ ادبی تنقید کے لیے بے حد ضروری بھی تھا۔ اگر ادب کا یہ سائنسی مطالعہ پورے طور پر سائنسی رنگ میں رنگ گیا ہوتا تو پھر علم کیمیا کے مطالعے اور شاعری کے مطالعے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ در حقیقت تنقید کو سائنٹفک بنانا ان اصولوں کو سائنٹفک بنانا ہے جن اصولوں کو مدّ نظر رکھ ہم ادب کا تجزیہ کرتے ہیں۔ تنقید کی بھی سائنٹفک تکنیک فن پارے کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس کی تہہ تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ نے اپنے ایک مضمون میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یکے بعد دیگرے دو معیاروں کا استعمال کریں۔ یعنی خالص ادبی معیار اور غیر ادبی معیار۔ عام طور پر تحسین اور محاکمے میں ہم یا تو ادبی کارنامے کے کسی پہلو پر اظہار رائے کرتے ہیں یا پھر موضوع کی معنویت اور پھیلاؤ پر۔ اس سے ادبی کارنامے کی سالمیت مجروح ہوتی ہے۔ ادبی کارنامہ ایک مکمل وجود جسے اس طرح عناصر کے تفریق اور انتشار کے ساتھ دیکھنا درست نہیں۔ ایلیٹ کسی فن پارے کو کوئی ایسی الہامی چیز تسلیم نہیں کرتا جو شدت جذبات کے ساتھ ایک خاص شکل اور ایک خاص لمحے میں خود بخود وجود میں آگیا ہو وہ فن پارے کو ایک شے کی طرح سمجھتا ہے جسے سوچ سمجھ کر ناپ تول کر سلیقہ اور محنت سے تعمیر کیا جاتا ہے جس کا مقصد ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ کام ایلیٹ کے خیال میں بصری امیجز اور موزوں الفاظ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ ایلیٹ کے اس قول کی روشنی میں ادب کے مطالعے میں الفاظ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ الفاظ بمعنی زبان۔ اپنے اندر لازوال قوت کا خزانہ رکھتے ہیں۔ الفاظ اور زبان کے ذریعے ہی ادیب یا شاعر کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ جمالیاتی احساس کو فکری احساس میں تبدیل کر دے۔ الفاظ اور زبان ہی کے وساطت سے یہ موقع میسر آتا ہے کہ وہ اس ردعمل کو جسے آرٹ کے مواد نے اس کے اندر پیدا کیا ہے ایک لطیف اور نازک سانچے میں ڈھال دے۔ روایتی ادبی تنقید میں ایک عام غلطی جو ہم سے سرزد ہوتی ہے وہ یہ کہ ہم الفاظ کو ایک بے جان اور منفعل سی چیز سمجھتے ہیں اور انھیں اس پورے عمل میں ایک ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ ہم بہت آسانی سے یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ الفاظ نہ صرف جذبات کی زبان ہیں بلکہ وہ جذبات میں گہرائی ہمواری اور زرخیزی بھی پیدا کرتے ہیں اور محض مطالب کو خارجی لبادہ نہیں پہناتے بلکہ ان کی وسعتوں میں اضافہ کرتے ہیں اور ان میں وزن و وقار پیدا کرتے ہیں۔ گو یہ حقیقت ہے کہ اسلوب صرف الفاظ کا نام نہیں لیکن ہم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اسلوب وہیں

نظر آتا ہے جہاں شخصیت الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کی شخصیت مزاح کے رنگ کے بغیر مکمل نہیں۔ غالب کی شخصیت میں نظر آنے والی مزاح کی حیثیت ان کے اسلوب کی شناخت بن جاتی ہے۔ مثلاً

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

• • •

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

• • •

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

• • •

ان مثالوں کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں غالب کی شخصیت الفاظ کا جامہ پہن کر ان کے اسلوب کی شناخت بن جاتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معیاری تنقید صرف جذباتی ردعمل کا نثری بیان نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تنقید بیک وقت موضوع، فن اور زبان پر نظر رکھتی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون سے انسانی مسائل ادبی اور فنی تخلیق میں سموئے گئے ہیں اور اس سلسلے میں کس قدر جمالیاتی قدروں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ روایتی اردو تنقید ہر شاعر کو علاحدہ علاحدہ دیکھتی رہی ہے۔ یہ ریاست کا امام ہے — یہ رجائیت کا پیغمبر۔ ذاتی حالات اور محض تجربات کا تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ لیکن در اصل تنقید اس وقت تک معیاری نہیں ہو سکتی جب تک شخصی تاثرات کو خارجی حقائق کی روشنی میں پرکھ کر نہ دیکھا جائے۔ یہ درست ہے کہ ہر تنقید میں خواہ وہ جمالیاتی ہو یا عمرانی، فنی ہو یا رومانی، وجدانی ہو یا نفسیاتی یا سائنٹفک ذاتی تاثرات کا شامل ہونا یقینی ہے۔ لیکن اگر ہم اس کو منزل قرار دے دیں تو پھر ایسی تنقید غیر تشفی بخش کہلائے گی۔

میڈلٹن مرے کا یہ قول کہ اسلوب میں ادبی حسن کا تجربہ شامل ہوتا ہے اسلوب کی اہمیت کا اظہار کرتا ہے۔ اور مواد اور زبان کے رشتے کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ کوئی فنی کارنامہ آئیڈیلوجیکل کنٹنٹ کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا اور مواد اور ہیئت کی مکمل ہم آہنگی کے بغیر ہم ادب یا فن پارے میں اسلوبی کشش کا تصور نہیں کر سکتے کیونکہ زبان یا الفاظ کی مدد سے ہی عام تجربہ گہرائی اور معنی خیزی حاصل کرتا ہے۔ ہر نظم ایک لسانیاتی تنظیم ہے۔ جس میں ہر ایکائی کی اپنی اہمیت ہے ان لسانیاتی ایکائیوں کی باہمی ترتیب و ترکیب ہی ادبی حسن یا اسلوبی کشش پیدا کرتی ہے۔ مثلاً لفظ کی تکرار شعر کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے تو کبھی شعر میں الفاظ کی صوتی حیثیت غور طلب ہوتی ہے۔

— — —

قطرہ قطرہ آنسو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے
پارہ پارہ دل ہے جس میں تودہ تودہ حسرت ہے

— — —

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

— — —

عالم عالم عشق جنوں ہے
دنیا دنیا وحشت ہے
ہیں دریا دریا روتا ہوں
صحرا صحرا وحشت ہے

— — —

گرنے لگی صفوں پر جھڑا جھڑ ادھر ادھر
ہر قصر تن گرائے دھڑا دھڑ ادھر ادھر

— — —

اوپر کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مواد (MATTEN) اور لسانیاتی ایکائیوں کی مکمل ہم آہنگی ہی اسلوب کا معراج ہے۔ لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تنقید داخلی ([illegible]) نہ ہو کر معروضی ([illegible]) ہو تو پھر ہمیں لسانیات اور تنقید کے درمیان ایک راستہ تلاش کرنا ہوگا جس کے ایک طرف تخلیق کار کے تخلیق کی روح تک پہنچنے کی کوشش ہوگی تو دوسری طرف تخلیق کی زبان و بیان کا بھی تجزیہ ہوگا۔ ادبی تنقید اور لسانیات اگرچہ ذہن انسانی کی دو مختلف تحریکیں ہیں لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان خط نہیں کھینچا جا سکتا ان دونوں کی مکمل ہم آہنگی ہی تنقید کا معیار ہے۔

اسلوبیات ہماری تنقید کا نظریہ بھی ہے اور عمل بھی۔ اسلوبیات کی بنیاد اس نظریے پر رکھی گئی ہے کہ ادب ایک [illegible] ہے۔ فن پارے کی شکل میں ادبی تخلیق زبان کے دائروں میں بندھی ایک [illegible] ایکائی ہے۔ زبان اور مواد کے اٹوٹ رشتے کو مدنظر رکھ کر ان ماہرین اسلوبیات نے ایک ایسے نظریے کا اختراع کیا ہے جس میں ادبی تخلیق کے تجربے کے کسی بھی سطح پر زبان کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ زبان کی ماہیت ساخت اور مزاج کا مطالعہ علم لسانیات کی روشنی میں ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا اسلوبیات نے ادبی تخلیق کے سائنسی مطالعے میں علم لسانیات کے اصولوں سے کافی استفادہ کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلوبیات جس تنقیدی تکنیک کی بات کرتا ہے۔ اس تنقیدی تکنیک کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ تنقید نگار ادب کے ساتھ ساتھ لسانیاتی اصولوں سے بھی آشنا ہو۔ لہٰذا کسی بھی

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

جدوجہد آزادی کا ایک شاندار باب

راجونت سنگھ رانا

ہندوستان کی جنگ آزادی پر سرسری نظر ڈالنے والا یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ جدوجہد آزادی میں تشدد اور عوام تشدد دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ غلط فہمی کا شکار ہو کر یا حقائق کو نظر انداز کرنے والا ہی اس جدوجہد کو عدم کی تحریک کا نام دے سکتے ہیں باقی سب لوگ دونوں طرح کی جدوجہد کو تحریک آزادی کے اٹوٹ حصے سمجھتے ہیں۔

پہلی عالم گیر جنگ کے بعد بین الاقوامی اور قومی حالات نے جو موڑ لیا اس کے بارے میں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرف برطانوی اپر ملیسٹ جنگ کے دوران کیے گئے وعدوں سے منہ موڑ چکے تھے۔ دوسری طرف لام بندی کے ختم ہو جانے کی وجہ سے فوجیوں کو نکال کر انھیں بے روزگاری کے منہ میں پھینک دیا گیا تھا، تیسری طرف کھیتوں کی پیداواروں کی قیمتیں کرنے سے کسان مالی بحران کا شکار ہو گئے تھے، چوتھی طرف منٹو مارے سکیم کے تحت برطانوی امپریلسٹ ہندوستان کے سیاسی جیون میں فرقہ پرستی کو داخل کر رہے تھے۔ پانچویں طرف متذکرہ بالا وجوہات کی بنا پر ہندوستانی عوام میں پھیلی بے چینی کو دبانے کے لیے رولٹ ایکٹ کی تشکیل کر چکے تھے۔ اور عوامی جدوجہد کو خون میں ڈبونے کی تیاری کر چکے تھے۔

ایسے حالات میں عوامی غصے اور عوامی جدوجہد کی چھٹ پٹ جھڑپوں سے مجبور ہو کر کل ہند کانگریس کمیٹی عدم تعاون کی تحریک چلا چکی تھی اور چورا چوری کے واقعہ کے بعد اسے واپس لے چکی تھی۔ جس کا فائدہ اٹھا کر امپریلسٹ حاکموں اور ان کے گرگوں نے ہندو مسلم فسادات کا طوفانِ بدتمیزی مچا دیا تھا۔ اور عوامی اتفاق و بھائی چارہ اور یکجہتی تہس نہس ہو چکی تھی۔

خلافت تحریک بھی ایک ماضی کی یاد بن کر رہ گئی تھی۔

جلیاں والا باغ اور مارشل لا کے ظلم بھی بھلائے جا رہے تھے۔

اکالی تحریک کے اسباق کو بھی نظر انداز کیا گیا تھا۔

کل ہند کانگریس کمیٹی کی طرف سے عدم تعاون کی تحریک واپس لیتے وقت جو زمینداروں کے حق میں ریزلیوشن پاس کیا گیا تھا۔ اس سے کسان، مزدور، درمیانہ طبقہ، پڑھا لکھا نوجوان طبقہ اور انقلابی تنظیمیں سخت ناراض تھیں۔ اور وہ ایسی تنظیمیں قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے جو سامراجی حکمرانوں نے خاتمہ کے بعد کسان مزدور راج کو قائم کر سکیں۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب، جس کو روسی عوام سوشلسٹ انقلاب کے نام دیتے ہیں۔ نے بھی ان لوگوں کی رہنمائی کی۔

امپریلزم دشمن عوامی اتحاد کو قائم کرنے کے لیے انقلابی نوجوان ہتھیلیوں پر سر رکھ کے آگے بڑھے سابقہ تجربات اور حالیہ حالات کا انھوں نے تجزیہ کیا۔ اور ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کی تشکیل کی گئی۔ اور اس تنظیم کے قیام میں ساتھی سچندر ناتھ سانیال نے نمایاں کردار ادا کیا کیونکہ اس سے پہلے وہ غدر پارٹی کے خفیہ کام سے متعلق رہ چکے تھے۔ اور پہلی جنگ کے خاتمہ کے بعد جن سیاسی کو رہائی نصیب ہوئی ان میں سے آپ ایک تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس تنظیم کے پروگرام کا میدان عمل صوبہ سرحد، پنجاب، دہلی، یوپی اور راجستھان تھا۔ لیکن ساتھی سانیال کی وجہ سے اس کا تال میل بنگال و بہار اور جنوبی ہندوستان کے انقلابیوں سے بھی تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت کی مرکزی سرکار کی خفیہ ایجنسیاں اس تنظیم کو بنگال کی انوشیلن سمتی کا ہی ایک حصہ سمجھتی تھیں۔ حالانکہ "سوشلسٹ" لفظ جو اس تنظیم کے نام میں شامل ہے۔ وہ انوشیلن سمتی کے آئین میں کہیں نہیں ہے اور اس اضافے کا ذمہ دار بھگت سنگھ کو بھی مانا جاتا ہے۔

کامریڈ مہر چند آہوجہ آف راولپنڈی اپنے ایک مضمون بعنوان "کاوانِ انقلاب" میں رقم طراز ہیں

"دلی گیٹ کے باہر کوٹلہ فروز شاہ کے کھنڈرات میں آٹھ انقلابی۔ چندر شیکھر آزاد، بھگوتی چرن وہرہ، بھگت سنگھ، بٹوکیشور دت، سکھ دیو، راج گورو، یشپال اور وجے کمار سنہا۔ اکٹھے ہوئے۔ وہ عالم و فاضل، فلسفی ماہر اقتصادیات، سیاسی امور و رموز کے واقف کار اور سماجی مطالعہ سے لیس تھے۔ انھوں نے چندر شیکھر آزاد کو ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کا کمانڈر ان چیف مقرر کیا۔ اور ہتھیلی پر سر رکھ کر برطانوی امپیریلزم سے لوہا لینے کا عہد مستقیم کیا۔ اور پھر سامراجی دشمن مورچہ کے قیام کے لیے انقلابی اقدامات کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ ان انقلابی اقدامات میں سے اہم و مشہور اقدامات ہیں۔

مرکزی اسمبلی میں بم پھینکنا، ساندرس قتل، والسرائے ٹرین بم کیس، امرتسر کالج بم کیس، سول سرجن قتل کیس (پشاور)، گورنر شوٹنگ کیس لاہور۔ شالامار بم کیس، پنجاب چکردتی بم کیس۔

اور ان اقدامات کے نتیجے کے طور پر وہی سامراجیہ دشمن حالات و ماحول پیدا ہو گئے۔ جس کی خواہش شہید اشفاق اللہ نے پھانسی کے تختہ پر چڑھنے سے پہلے کی تھی۔

ستمبر ۱۹۸۳ء

دار و رسن کو چومنے کے پہلے شہید اشفاق اللہ سے دیش کے نام پیغام دینے کو کہا گیا تو انھوں نے کہا "کل ہند کانگریس کمیٹی کی طرف سے جاری کردہ تحریک عدم تعاون کے وقت جو سامراجیہ دشمن عوامی اتحاد قائم ہوا تھا۔ نوجوان اس کو پھر سے قائم کریں۔ تبھی غلامی کا طوق گلے سے اتارا جا سکے گا۔"

اور تواریخ گواہ ہیں کہ ان نوجوانوں نے ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کے تحت اپنے کارہائے نمایاں سے، شہید اشفاق اللہ کی خواہش کو پورا کر دکھایا۔ کیونکہ اپنے انقلابی اقدامات سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ برطانوی امپریلزم نہ تو غیر مفتوح ہے اور نہ ہی وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کو غلام بنائے رکھ سکتا ہے اور وہ امپریلزم دشمن تحریک کو بھی نئے سے نئے طبقات اور علاقہ جات میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

ان اقدامات سے عوامی تحریک کو بھرپور طاقت ملی۔ مزدوروں اور کسانوں کے اندولن جگہ جگہ نظر آنے لگے جن سے پریشان ہو کر برطانوی حکومت نے مرکزی اسمبلی میں دو بل، بنام پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈ ڈسپیوٹ بل پیش کیے تاکہ ان تحاریک کا گلا گھونٹ دیا جائے

اس سے پہلے حکومت ہندوستان بھر میں سے مزدوروں اور کسانوں کے راہنماؤں کو گرفتار کر چکی تھی اور ان پر میرٹھ سازش کیس نام کا مقدمہ چلا رہی تھی۔

آٹھ اپریل ۱۹۲۹ء کو سردار بھگت سنگھ اور شری بٹوکیشور دت نے انھیں دو بلوں کی مخالفت ظاہر کرنے کے لیے بم پھینکے تھے۔ اور پرچے بانٹے تھے۔

"انقلاب زندہ باد" کو سب سے پہلے انھیں دو انقلابی جوانوں نے نعرے کا روپ دیا تھا۔ جو بعد میں ایک عوامی نعرہ بن گیا۔

ایک امپریلزم دشمن نعرہ۔

انقلاب سے ہندوستان سوشلسٹ ہارپبلکن آرمی کی کیا مراد تھی، اسے ۶ جون ۱۹۲۹ء کو سیشن جج۔ دہلی کی عدالت میں سردار بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت نے اپنے تحریری بیان میں صاف کیا۔ انھوں نے تحریر کیا تھا کہ "انقلاب سے ہماری مراد ہے کہ بے انصافی کی بنیاد پر تعمیر اس سماج میں بنیادی تبدیلی"۔ اور مرکزی اسمبلی میں بم پھینکنے کے اپنے مقصد کے بارے میں آپ دونوں نے کہا "سماج کی صحیح سکتی کے سمتی کار محنت کش عوام ہیں۔ اور عوام حکومت کا قیام ہمارا منتہائے مقصود ہے۔"

آج اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی اور اور انوشیلن سمتی کے انقلابی نوجوانوں کے کارہائے نمایاں تھے۔ جن سے مجبور ہو کر کل ہند کانگرس کمیٹی کو اپنے سالانہ سیشن جو کہ لاہور میں ہوا۔ میں تحریک آزادی جس کی راہنمائی کانگرس کر رہی تھی۔ کا منتہائے مقصود مکمل آزادی قرار دینا پڑا۔ اور حکومت دشمن تحریک چلانی پڑی۔

اس مضمون میں میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مرکزی سرکار کی خفیہ ایجنسیاں انوشیلن پارٹی کو ہی ہندوستان ریپبلکن آرمی کا سربراہ مانتی تھیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان سالوں میں جو انقلابی اقدامات اس کی راہنمائی میں سرانجام دیے گئے۔ ان کا بھی مختصراً ذکر کیا جائے تاکہ انقلابی تحریک کو ٹھیک طرح سمجھا جا سکے۔

مشرقی اور جنوبی ہندوستان میں مندرجہ ذیل انقلابی ایکشنوں کا تواریخ میں بھرپور چرچا ہے۔

چٹاگانگ آرمری کیس، کارپورل فائیٹ کیس نومبر ہٹ انسپکٹر جنرل قتل کیس ڈھاکہ، چندرنگر ریڈ کیس، یورپین کلب ریڈ کیس، ہٹبلی، اوٹی بم کیس، گوہیر گاؤں ریڈ کیس، کرکٹ کراؤنڈ اکسیڈنٹ کیس، وعدہ معاف (غدار)

ان تمام انقلابی حادثات و واقعات کا مقصد سامراجیہ دشمن تحاریک کا مضبوط بنانا تھا اور سرکاری حکام جو ظلم و ستم کے مجسمہ بن چکے تھے ان کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا تھا۔ اور اس مقصد میں یہ انقلابی مکمل طور پر کامیاب ہوئے۔

ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کے شہید ہماری جنگ آزادی کے درخشاں ستارے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ سماج وادی سماج کے قیام کے لیے متحرک کرتے رہیں گے۔ کیونکہ ان کے منتہائے مقصود کو ابھی حاصل کرنے کے لیے سرگرم جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ہم یوم جمہوریت کے موقعہ پر ان شہیدوں کو ہدیہ تبرک پیش کرتے ہیں۔ اور عہد کرتے ہیں کہ ہم سماج واد کے قیام کے لیے جدوجہد میں سرگرم حصہ لیں گے۔

"خالد رحیم کا مجموعۂ کلام تازگی اور شگفتگی کا بھرا پُرا چمن ہے۔ اُن کے اشعار میں احساس کی نرمی اور لطافت بھی ہے اور عصری زندگی کے مسائل کا شعور و ادراک بھی ایک ایسے دور میں جب شاعری کا چہرہ ابہام کے بڑھتے ہوئے سایوں نے مسخ کر رکھا ہے۔ خالد رحیم کی شاعری جمالیاتی کیفیات اور عصری دردمندی سے معمور ہے۔"

(ڈاکٹر محمد حسن)

خالد رحیم کی غزلوں کا پہلا مجموعہ

عکس در عکس

قیمت۔ -/۲۰ روپے

بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے

ملنے کا پتہ:

۱۔ نجمی اکیڈمی۔ پولیس لین۔ بخشی بازار۔ کٹک

۲۔ خالد رحیم۔ بخشی بازار۔ کٹک اڑیسہ

نظمیں

اس کے لئے میں ہر منزل تک آسکتا ہوں لیکن وہ
گیسو گیسو دار ورسن تک جاسکتا ہوں لیکن وہ
اپنے غم سے میں خود ہی ٹکرا سکتا ہوں لیکن وہ
کوئی بھی رت ہو اپنا جی بہلا سکتا ہوں لیکن وہ
تنہا تنہا پل بھر جینا مشکل تھا پر اتنے سال
کیسے گزارے ہیں میں نے بتلا سکتا ہوں لیکن وہ
عشق وہوس کی آگ میں یار و جب چاہوں جل سکتا ہوں
ہر دل میں جذبات کی تو بھڑکا سکتا ہوں لیکن وہ
جس کا جو کچھ قرض تھا مجھ پر یوں میں نے بیباق کیا
جس جا چاہوں جب جب چاہوں جا سکتا ہوں لیکن وہ
دشت وفا میں سارا عالم کھویا کھویا سارہ جائے
یوں بھی کتنے خواب حسیں دکھلا سکتا ہوں لیکن وہ
دنیا والے شاعر سمجھیں دل والوں میں نام رہے
یوں بھی دل کے داغوں کو دکھلا سکتا ہوں لیکن وہ
کتنے روپ بدل سکتا ہوں کیا کیا بات بنا سکتا ہوں
اب بھی اسے اقبال عمر اپنا سکتا ہوں لیکن وہ

اقبال عمر

کیا ہے اپنی دنیا میں نے سوچا ساری ساری رات
اس کی یادوں کی خوشبو سے مہکا ساری ساری رات
یوں بھی ہوا ہے اکثر اپنا جگنا ساری ساری رات
دور افق پر ایک ستارہ چمکا ساری ساری رات
میرے خوابوں کی عظمت نے میرا جی یوں بہلایا
جیسے برہ کی اگنی میں ہو جلنا ساری ساری رات
میں نے سمندر سے تو اٹھتے طوفانوں کو دیکھا ہے
لیکن دل سے طوفانوں کا اٹھنا ساری ساری رات
شور بڑے شہروں میں بہت ہے لیکن میں نے دیکھا ہے
بھولی بسری یادوں کا وہ میلہ ساری ساری رات
ایسی ویسی کوئی خبر تو ہے ہی نہیں اخباروں میں
کیسی کیسی باتوں پر میں رویا ساری ساری رات
جو کچھ تھا قربان کیا ہے تم سکوں بھی پاس نہیں
ہنستا رہا ہے دریا دلی پر دریا ساری ساری رات
ساری دنیا ہم سے خفا تھی لیکن ایسے عالم میں
ذہن میں آیا ان آنکھوں کا ملنا ساری ساری رات
کس کو خبر ہے اپنا مقدر یہ ٹھہرا اقبال عمر
نگری نگری دوارے دوارے پھرنا ساری ساری رات

یہ دنیا دن بدن تبدیل ہوتی ہے
نئے موسم پرانی خاک سے آواز دیتے ہیں
ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی ہیں
ہوائیں رفتگاں کے آنگ میں
گنجان جنگل کے درختوں سے لپٹ کر
گریہ کرتی ہیں
غرض سارے مناظر ایک گہرے دکھ کا پرتو ہیں
مگر یہ سب ذرا سی دیر کو ہوتا ہے
پھر سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں
ہنگاموں میں کھو جاتے ہیں رات آتی ہے سو جاتے ہیں

جہاں آداب فرزندی کا سلسلہ ہم سب نے زیبری زندگی اپنی
اب وہ زمیں سا عتوں کی
اور منتظران سیاہ پوری کی کر چکی اپنی
جو اس کو ایک گہری چیخ میں تبدیل کر دیں
تو اب ہم کیوں نہ اپنی نسل کو کچھ پھل دیں
اور ان کو وہ پابندیاں بالکل نہ دیں
کہ آنکھوں سے و دیعت ہیں
جو تازہ وار دان دنیا ہیں
یہ اس لمحہ مری دنیا میں
ذرا آزاد ہو کر سانس لیں
اور خود ہی اپنا سامان سفر یکجا کریں

اسعد بدایونی

آتش فشاں

تمہیں جو کہنا ہے کھل کر کہو مرے یارو
میں آشنائے زمانہ ہوں اور سمجھتا ہوں
کہ میرے گیتوں کی اس شہر میں لبادہ ہے کیا
وہ لوگ بھی ہیں برابر مرے کرم فرما
جو دے رہے ہیں شب و روز بددعائے قضا
مرے خیال کی تپتی ہوئی جوانی کو
یہ سوچ کر کہ وہ آتش فشاں جو ان کیلئے
پیام مرگ ہے، بجھ جائے مرے اندر ہی
وہ آگ میری زبان کو ترستی رہ جائے
سلگ رہی ہے برابر ابھی میری جوشی میں
مگر وہ لوگ جو برہم ہیں میرے گیتوں سے
یہ بات بھول گئے ہیں کہ جب کوئی شاعر
سلگتے دل کو سجاتا ہے اپنے ہونٹوں پر
تو گونج اٹھتے ہیں وہ گیت جن کی سچائی
کسی بھی جھوٹ کے پردے کو چیر سکتی ہے
تمہیں جو کرنا ہے کرتے رہو مرے یارو
مجھے یقین ہے مرے گیت مر نہیں سکتے

اندر سروپ دت نادان

گروہوں میں اُگے چہرے

یہ سب چہرے
گروہوں میں اُگے چہرے
گروہوں میں پلے چہرے
یہ صف آرا، یہ بل کھاتے، یہ ٹکراتے ہوئے چہرے
یہ آویزش کی تپتی دوپہر کے خشمگیں چہرے
یہ چہرے جن کے قامت کی بلندی
سپہری چھو کر گزرنے
ابھر آتے ہیں صدہا نفرتوں کے داغ
ہر انگلی کے پورے پر
یہ چہرے جن کی سفاکی کے عبرتناک افسانے
لکھے جاتے ہیں ہر دن شہر کی دیوار گریہ پر
یہ چہرے جو رکھتے ہیں سیدھی مستقل اپنے نشانے پر
یہ چہرے چھپکلی کی طرح ہر دم جو شکار آمادہ رہتے ہیں
یہ چہرے جن کی پیشانی پہ
حرف مدعا لکھا ہوا ہے کالے حرفوں سے
یہ چہرے جن کے نرغے میں
صداقت منصفی کی راہ سے نظریں چراتی ہے۔
یہ چہرے جو پنپتے ہیں۔
عداوت کی غلاظت میں، دھڑے بندی کی لعنت میں
یہ چہرے بر سر منبر
یہ چہرے بر سر محفل
ابھی تک سرخرو ہیں کیوں کہ بے چہرہ سیاست میں
ابھی تک قد رہستی کا کوئی چہرہ نہیں ابھرا

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

دو نظمیں

دیارِ خواب

دیارِ خواب کے اُدھر
مسافروں کی بستیاں
نشیلی کالی بدلیاں، شرابیوں کی ٹولیاں
نشہ بڑھاتی دھانی چنریاں
مہکتے کنوارے جسم، چلمنوں کی تیلیاں
سجیل ریشمی پروں میں رنگ برنگی تتلیاں
پکی پکائی عورتوں میں شہوتوں کی بجلیاں

ذرا سی رات بھیگ جائے،
پھر سنو اندھیرے کی زباں
تھکے تھکائے جسم، ہانپتی لٹکتی چھاتیاں
شفیق آنکھیں ماؤں کی، رحیم لوریاں
خزاں لُٹاتی کہکشاں،
دھواں اگلتی چمنیاں
دھڑکتے دل، نڈھال جسم، دھوپ کے مکاں
سنہرے، سرخ پیرہن بھگوتی شہزادیاں
گدیلے گندے پوکھروں میں تیرتی ہیں مچھلیاں
نہ جانے کس گناہ کی سزا ہیں بہتی ندیاں
دیارِ خواب کے اُدھر
مسافروں کی بستیاں !!

پرچھائیاں پکڑنے والے

ڈائری کے یہ سادہ ورق
اور قلم چھین لو
آئینوں کی دکانوں میں ہم
اپنے چہرے لئے
اک برہنہ تبسم کے محتاج ہیں
سرِ بازار ہیں،
ایک بھی چاہنے والا ایسا نہیں
جو انھیں،
زندگی کا سبب بخش دے
دھند سے جگمگاتے ہوئے شہر کی بتیاں
سجدہ کرتی ہوئی کہکشاں
خوبصورت خداؤں کی پھرتی ہوئی ٹولیاں
ایسا لگتا ہے سب
ایک مدت سے پرچھائیوں کو پکڑنے میں مصروف ہیں

دو غزلیں

حدِ نگاہ تلک ایک سلسلہ دیکھیں
سنیں تو سارے مناظر کو بولتا دیکھیں
طویل راتوں کو سورج کے روبرو رکھ دیں!
چمکتی دھوپ میں خوابوں کا حوصلہ دیکھیں
وہ بھیڑ ہے کہ بدن لمس کو ترستے ہیں
وہ شور ہے کہ سماعت کو کانپتا دیکھیں
لہولہان زبانیں دیوار سے چمٹی!
ہمیشہ خواب کسی مرغزار کا دیکھیں
انھیں یہ فکر کہ امن و اماں سے گزرے
ہمیں خیال کوئی تازہ حادثہ دیکھیں

مشعل ہاتھوں میں لے کر آ گئے ہیں
حدوں سے ہم نکلنا چاہتے ہیں
سنا ہے شہر میں کچھ شوخ بچے
انہونی باتوں پر ہنسنے لگے ہیں
کوئی منظر نہ اب کے ساتھ ہوگا
بہت عجلت میں ہم تجھ سے ملے ہیں
سفر اس بار تو گھر کی طرف تھا
قدم کچھ دن سے پھر بہکے ہوئے ہیں
زمیں کی کچی خوشبو کہہ رہی ہے
ادھر ہو کر کبھی دریا بہے ہیں
یہ اُن اسلاف کے نقشِ قدم ہیں
جو ان خیموں سے آگے بھی گئے ہیں

آشفتہ چنگیزی

غزلیں

جو زندگی نہ سمائی تری نگاہوں میں
تمام عمر وہ بھٹکی غموں کی راہوں میں
اثر ہوا تو ہے اتنا ہماری آہوں میں
سکون قلب نہیں اُن کو جلوہ گاہوں میں
وہ بدنصیب اگر جائے تو کہاں جائے
اماں نہ مل سکی جس کو تری پناہوں میں
نکل کے گھر سے کیے درس خود شناسی دیں
قدم قدم پہ خرد ہے جنوں کی باہوں میں
یہ غم ہیں کہ ہمیں دشمنوں نے زخم دیئے
کچھ اپنے دوست بھی شامل تھے سیر راہوں میں
نہ جانے کس لئے احباب میرے دشمن ہیں
میرا شمار گداؤں میں ہے نہ شاہوں میں
رہ حیات میں ہر موڑ پر پس پردہ
گناہگار ہیں پوشیدہ بے گناہوں میں
سمجھ کے اپنا لگایا تھا جن کو سینے سے
میرے خلاف وہی لوگ تھے گواہوں میں
تلاش عظمت ماضی نہ ڈھونڈیئے طالبؔ
وہ بات اب کہاں پہلی سی کج کلاہوں میں

طالبؔ عرفانی

اُٹھائیں کیوں نہ تیشے مشتعل موجیں سمندر کی
کھنچی ہے شہر کے چاروں طرف دیوار پتھر کی
بھنچی تھیں مٹھیاں آنکھوں میں تھی اک جگمگاہٹ سی
بپھرتے پانیوں سے لاش یوں ابھری شناور کی
کرے منت رائگاں مستی مسلسل آفتاب اپنی
سیاہی بام و در پر ہے چراغوں کے مقدر کی
اُبھرتے ہیں خرابے جس کے قدموں کے نشانوں سے
مرے کانوں میں ہے آہٹ اسی سفاک لشکر کی
اچانک خاک میں مدفون اک بستی نکل آئی
مجھے تھی جستجو اک کمشدہ ساعت کے پیشہ کی
ہیں ہر جانب سے بھولے اگر گسوں کی یورشیں عشرتؔ
برہنہ لاش پر اک لمحۂ شاداب و بہتر کی

عشرتؔ ظفر

نہ کوئی کھیت نہ ٹوٹا مکان ہے بھائی
یہ خارزار ہی صحرا کی جان ہے بھائی
نہ کوئی چھت نہ کوئی سائبان ہے بھائی
ہمارے سر پہ کھلا آسمان ہے بھائی
یہ سخت دھوپ، یہ صحرا، یہ پیاس کی شدت
لبوں پہ آب تو مسافر کی جان ہے بھائی
زمانہ اُس کو تقدس مآب کہتا ہے
وہ جس کے ماتھے پہ کالا نشان ہے بھائی
ابھی سے باز نہ آ تو ستم شعاری سے
ابھی تو سر پہ مرے آسمان ہے بھائی
ہر ایک ظلم و ستم کا جواب خاموشی
ہماری قوم بڑی بے زبان ہے بھائی
یہ سچ کہ قتل ہوئے ہیں ہزارہا انساں
مگر ہے دعویٰ کہ امن و امان ہے بھائی
نگاہ ناز سے وہ جس کو دیکھ لیں عشرتؔ
وہ شادماں ہے وہی کامران ہے بھائی

عشرتؔ صدیقی

آغوشِ خزاں میں بھی سنور جائیں گے ہم لوگ
اپنا ہی لہو پی کے نکھر جائیں گے ہم لوگ
خوابوں کے حسیں شہر بسائے ہوئے دل میں
ہر کوہ و بیاباں سے گذر جائیں گے ہم لوگ
ٹھہرے گا وہیں قافلۂ عمر سبک گام!
جس منزلِ ہستی پہ ٹھہر جائیں گے ہم لوگ
گلشن ہو کہ صحرا ہو خیاباں ہو کہ کہسار
نقشِ کفِ پا ہوں گے جدھر جائیں گے ہم لوگ
ہر حال میں جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے!
کیا گردشِ ایام سے ڈر جائیں گے ہم لوگ
مٹی کے کھلونوں کا مآل آپ نہ پوچھیں
ذرات کے مانند بکھر جائیں گے ہم لوگ
لفظوں کے تعاقب میں، حزیںؔ آپ ہی رہیے
آشوبِ معانی سے گذر جائیں گے ہم لوگ

جنید حزیںؔ لاری

✦✦✦✦✦✦✦

غزلیں

ان درختوں میں آندھیاں رکھ جا
آندھیوں میں تباہیاں رکھ جا
جانے والے سفر مبارک ہو
شہر بھر میں اداسیاں رکھ جا
ہر پرندہ ہوا ہے تن آساں
ہر نشیمن میں بجلیاں رکھ جا
کوئی منظر تو دیکھ پاؤں میں
کوئی لمحہ تو جاوداں رکھ جا
چلچلاتی ہے دھوپ دور تلک
اپنے آنچل کا سائباں رکھ جا
جو ملے بے دلی سے لے راشد
جو بھی پائے جہاں تہاں رکھ جا

راشد جمال فاروقی

یہ پیاس کی آگ نے جس دل کو جلایا ہوگا
اُس نے اِس گاؤں میں تالاب بنایا ہوگا
شام کا وقت ہے بستی کی طرف مت جاؤ
جلتے چولہوں کا دھواں گھر میں سمایا ہوگا
جان و دل فکر و نظر، ذہن و خیالات و شعور
کرب کی آگ نے کس کس کو جلایا ہوگا
گاؤں میں پھیل رہی ہے جو سہانی خوشبو
تم نے آنگن میں کوئی پیڑ لگایا ہوگا
رات برسات بھی، خلوت بھی، ہوا بھی، تم بھی
ایسے موسم نے کئی بار جگایا ہوگا
ریگزاروں میں ذکی پیڑ کا سایہ بھی نہیں
دھوپ میں اُس نے کہاں زخم سکھایا ہوگا

ذکی طارق

شمع حیات سوز الم سے پگھل گئی
اب کیا ہے شام غم جو سحر سے بدل گئی
تسکیں سے اضطراب کی صورت بدل گئی
موج نگاہ ناز یہ کیا چال چل گئی
تھا اضطراب دل خلش درد سے سوا
اب درد بڑھ گیا تو طبیعت سنبھل گئی
اب کیا نشاط موسم گل کیا غم خزاں
تھا جس پہ آشیانہ وہی شاخ جل گئی
نکہت یہی نہیں کہ وہ ہم سے بدل گئے
حالات و واقعات کی صورت بدل گئی

عذرا نکہت ٹونکی

افسانے

شوکت حیات

چٹان

اچانک اسے لگا کہ کسی نے اسے آواز دی ــــ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ قہر ڈھا رہی تھی۔ کئی دنوں سے دھوپ میں شدّت تھی۔ ایک زمانے سے دھوپ کا یہی عالم تھا کہ سکوں کی چند سانسیں لینا دوبھر ہوگیا تھا۔

اس وقت شاہراہ پر بھی سناٹا تھا۔ اس لیے قیامت خیز دھوپ میں وہ تنہا سفر کر رہا تھا۔ سورج کی کرنوں کی چمک آنکھوں کو اس قدر خیرہ کر دینے والی تھی کہ بصارت کچھ ہی آگے بڑھ کر دم توڑنے لگی۔

کسی نے آواز دی . . . . ؟ سڑک پر تو دور دور تک کسی کا نام و نشان نہیں . . . . !

اس نے سوچا۔ جہاں تک وہ دیکھ پاتا تھا۔ کوئی پرندہ تک موجود نہیں تھا۔ پسینے میں شرابور اس کے تنہا وجود کے ساتھ شناسا اور غیر شناسا چہروں کا ایک اژدہام ہمراہ تھا۔ تمام چہرے مختلف ہوتے ہوئے ایک سے تھے۔ ریاکاری کی شکنیں سبھوں میں یکساں تھیں ــــ اس کا سفر بظاہر تو ایک مخصوص دفتر تک تھا۔ جہاں وہ ایک شناسا کی نوکری کی درخواست داخل دفتر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا اصل سفر جانے انجانے چہروں کی انھیں ریاکار شکنوں میں درد کی نہریں رواں کرنا تھا۔ درد سے دوچار کرنے کا سنگلاخ عمل اسے اکثر و بیشتر لہولہو کر جاتا۔ جہاں سے درد کی لہریں چشمے کی مانند پھوٹتی تھیں، اس پر بہت بڑی چٹان پڑی تھی۔ ویسی بڑی اور بھاری چٹان اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ایک طویل عرصہ تو اس چشمے کی کھوج میں گزر گیا تھا۔ زندگی کا سنہرا زمانہ کتابوں اور چہروں کی سلگتی ہوئی پڑتال میں جھلسانے کے بعد اسے اس چشمے کے منھ پر چٹان کی موجودگی کا ادراک ہوا تھا۔ اس نے چٹان کو ہٹانے کی کوشش کی اور اسے لگا کہ اس بھاری چٹان کو ہٹانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

اس نے اطراف کے لوگوں کو بہت سمجھایا۔ علاقے کی خشک سالی کے اس بنیادی سبب کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ لیکن کوئی اس بات کے لیے آمادہ نہ ہوا کہ اس چٹان کو بے جگہ کیا جائے۔ اس کے پیچھے ان کی کوئی دلیل نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ باپ دادا کے زمانے سے اس چٹان کو وہیں دیکھتے آرہے تھے اور اسے وہاں سے ہٹا دینے سے ان تمام لوگوں کو کسی عذاب میں مبتلا ہو جانے کا خوف تھا۔

لوگوں کی اس جہالت اور روایت پرستی سے وہ عاجز آچکا تھا۔ بہت تھوڑے سے لوگ اس کی باتوں سے متفق ہوئے۔ ان تھوڑے سے لوگوں نے زور آزمائی کی لیکن چٹان ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اتنی بھاری اور بڑی چٹان کو ہٹانے کے لیے جمِ غفیر کی ضرورت تھی۔ زور آور بازوؤں والے جمِ غفیر کی۔

تین بجنے والے تھے۔ وہ تیز قدم بڑھانے لگا اس نے خیالات کو جھٹکا دیا۔ فارم جمع کرنے کی آج آخری تاریخ تھی۔ بے روزگاری کے لق و دق صحرا میں نوکری کے شجر کی تلاش عبث تھی۔ پھر بھی امیدوار کی جھوٹی تسلّی کے لیے وہ فارم جمع کر دینا چاہتا تھا۔ یہ جھوٹی تسلّی تو ایک زمانے سے لوگوں کو مرتے ہوئے بھی زندہ رکھے ہوئی تھی۔

اس نے جسم کی بچی ہوئی قوتوں کو مجتمع کر کے اپنے پاؤں کی رفتار تیز کی۔ لیکن جھلسا دینے والی شدید دھوپ کی تاب نہ لاکر اسے رک جانا پڑا۔ رکنے پر پورا وجود اور بھی سلگنے لگا۔ اس نے اغل بغل کسی سائبان کی تلاش کی۔ کہیں کوئی سایہ دار جگہ نہیں تھی۔ اسے پھر لگا کہ بہت دور سے آتی ہوئی آواز اسے چھونے کی کوشش کر رہی ہے۔

"بابو جی . . . . بابو جی . . . .

اس نے ذہن پر زور دیا۔ ان کٹھن گھڑیوں میں بھلا کون اسے آواز دے سکتا ہے۔ یہاں تو افراتفری کا عالم ہے۔ اپنا وجود بھی اپنے آپ سے بیگانہ ہو رہا ہے۔ ان لمحوں میں اتنی غرت اور احترام سے اسے کون پکار سکتا ہے۔ لوگوں کا بس چلے تو ناموں کے ساتھ جناب، شریمان، صاحب اور جی لگانے کے بجائے ایک دوسرے کو کتا اور خنزیر کہہ کر مخاطب کریں اور بغل میں رکھی ہوئی چھری ایک دوسرے کے وجود میں اتار دیں۔

آواز کچھ اور تیز ہوئی۔

"بابو جی . . . . . بابو جی . . . . سنئے . . . !

اس انجانی آواز کے اندر جو تڑپ تھی۔ اسے لگا کوئی اسے ہی پکار رہا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر سورج کی چندھیانی ہوئی روشنی میں کچھ بھی صاف اور واضح نظر نہیں آیا۔ بس ایسا لگا جیسے کوئی بہت دور سے تیزی سے آگے بڑھتا ہوا اس کی طرف آرہا ہے۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ خشک ہوتے ہوئے ہونٹ پر زبان پھیری۔ اس درمیان پیچھے سے آتا ہوا جسّم اس کی بغل میں کھڑا ہو کر اس کا ہاتھ جھنجھوڑ رہا تھا۔

"بابو جی . . . . . میں بہت دیر سے آپ کو پکار رہا تھا۔"

ایک لڑکا بہت زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ ذہن پر زور دینے کے بعد اسے یاد آیا کہ وہ اس کے دفتر کے پاس والے ڈھابے میں کام کرنے والا لڑکا تھا جو لوگوں کو چائے اور پانی پلایا کرتا تھا۔ اس لڑکے کی بے چارگی کی حد تک بڑھی ہوئی معصومیت اور کولہو کے بیل جیسی مشقت نے اسے اس پر بے حد مہربان بنا دیا تھا اور اکثر و بیشتر وہ اسے کچھ ٹپ دے دیا کرتا تھا۔ ایک زمانے کے بعد اس لڑکے کو اس سنگین موسم میں دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی۔

"اتنے دنوں سے تم کہاں تھے . . . ؟ گیان ٹی اسٹال میں تم پر بہت دنوں سے نظر نہیں پڑی ! ؟"

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اس کو دیکھ کر ہی اس بات کا خیال آیا تھا کہ وہ ٹی اسٹال میں بہت دنوں سے نظر نہیں آرہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اس دکان میں

آرام سے چائے پانی کے سلسلے کو جاری وساری دیکھ کر اس کی کمی کا خیال ہی نہیں آیا۔ اس سلسلے میں لڑکے نے جو کہانی سنائی وہ بے حد مختصر اور پراثر تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اس دکان کو اپنی دکان کی طرح سمجھتا تھا اور کبھی اس نے کوئی چیز ادھر ادھر نہیں کی تھی۔ گاؤں میں سوکھا پڑنے کے بعد وہ اس ہوٹل میں ملازم ہوا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ اسے بے تحاشا بھوک لگتی تھی۔ تین اوقات کے علاوہ بھی۔ ایسے میں اس سے کچھ بھی کرنا مشکل ہو جاتا مالک کے سامنے سموسے نکال کر کھانے لگتا۔

اس نے لڑکے کو بتایا کہ جن کے پاس کھانے کی اشیاء نہیں ہوتیں، انھیں جانوروں کی طرح بھوک لگتی ہے..... جب اشیاء آدمی کو آسانی سے مہیا ہونے لگتی ہیں تو پھر بھوک انسانوں کی طرح لگنے لگتی ہے۔

"ہاں بابوجی.... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں.... گاؤں میں جب سوکھا پڑا تھا تو مجھے اور بھی زیادہ بھوک لگتی تھی..... ہم تمام گاؤں والوں کو لگتی تھی.... لیکن وہاں پیٹ بھرنے کا کوئی اپائے نہ دیکھ کر سب لوگ ادھر اُدھر چلے گئے.... وہ گاؤں جنگل بن گیا.... یہاں اگر بھی بھوک لگتی ہے لیکن پہلے کے مقابلے میں کم.... ایک دن ایسی تیز بھوک میں، میں سموسے کھا رہا تھا مالک کے لڑکے نے کہہ دیا کہ تین وقت کے علاوہ تو جو کھاتا ہے وہ حرام کا ہے.... بس میں نے وہاں کام چھوڑ دیا بابوجی.... یہاں عزت نہیں وہاں.... آپ بھی تو اپنے بھاشن میں یہی بولتے ہیں یہی بولتے ہیں نا بابوجی...."

"بہت اچھا کیا تم نے.... اب کیا کر رہے ہو....؟"

لڑکے کی اطلاع کے مطابق جس دفتر میں اسے فارم جمع کرنے کے لیے جانا تھا، اسی کے قریب گنگا کے کنارے ایک ہوٹل میں اس نے کام شروع کر دیا ہے اور وہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اُسے بہت خوشی ہوئی۔

وہ دونوں تیز تیز چل رہے تھے۔ دفتر قریب آ رہا تھا۔ لڑکے نے اسے ہوٹل میں چل کر چائے پینے کے لیے کہا۔ اس نے لڑکے کو اپنی مجبوری بتاتے ہوئے واپسی میں آنے کا وعدہ کیا۔

فارم جمع کرنے والے آدمیوں کی بھیڑ میں جانوروں کی طرح دھکا کھانے، دھکا دینے اور کرتا پھڑوانے کے بعد جب وہ لوٹ رہا تھا تو معاً اس لڑکے کا خیال آگیا اور اس ہوٹل کی جانب اس کے قدم اٹھ گئے۔

لڑکے نے ہوٹل کے دروازے پر اسے وی۔ آئی۔ پی کی سی اہمیت دی۔ بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ہوٹل کی صاف کرسی اور میز کو دوبارہ پونچھا اور کھانے کی کئی چیزیں سامنے لاکر رکھ دیں۔ پھر فوراً جاکر اسپیشل چائے بنانے لگا۔ ان تمام کارروائیوں کے دوران میں اس کی مسرت دیکھنے کے قابل تھی۔ ہوٹل کے دوسرے لڑکوں اور مالک کی جانب وہ بیچ بیچ میں فخریہ انداز میں دیکھتا بھی جاتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہوٹل میں نہیں اپنے گھر پر ہے اور یہ سب کارکردگی اس کی میزبانی کے فرائض میں داخل ہے۔

تمام خاطر مدارات کے بعد وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوا کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ لڑکے کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا وہ اس کے قریب آیا۔

"بابوجی.... آپ پیسہ مت دیجئے.... آپ میرے مہمان ہیں.....!"

اس کی جیب میں پہنچی ہوئی انگلیاں جیسے سن ہو گئیں۔ یہ لڑکا کس قدر بھولا ہے۔ بھلا ہوٹل میں بھی مہمان داری ہوتی ہے۔ اور اس ہوٹل میں جہاں وہ ایک معمولی ملازم ہے۔ اسے کچھ عجیب لگا کہ اگر وہ پیسہ دیتا ہے تو لڑکے کا دل ٹوٹ جائے گا۔ کسی کو مہمان نوازی کے شرف اور مسرت سے محروم کرنا اسے ظالمانہ کارروائی معلوم ہوئی۔ اس نے جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ لڑکے کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ لیکن اس درمیان ہوٹل کے مالک کے چہرے پر کچھ ناگواری کے تاثر ابھرے۔ اس نے پھر سے جیب میں ہاتھ ڈالا ــــــ

اور ہوٹل کے دروازے پر آکر اس سے رخصت ہوتے وقت اس نے دیکھا کہ لڑکے کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ ایک گہرا سکوت۔ ایک نامعلوم اداسی لڑکے کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔ آنسو گال پر ڈھلک آئے تھے۔ جیسے انہوں کو رخصت کرتے ہوئے سوگواری کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہی الوداعی لمحوں کے کرب سے دوچار تھے۔

لڑکے کی آنکھوں کے آنسوں دیکھ کر اسے لگا کہ چشمے کے منھ پر پڑی ہوئی چٹان ایک ذرا کھسک گئی ہے۔

●●

غزلیہ ادب کی منفرد جہت

تحقیق کی گہرائیوں سے تجدید کی بلندیوں تک

غزل نئی دہلی

(نصف سالہ : یک صنفی)

ہر اشاعت ادب کاروں کی ایک دستاویز

مدیر

ایم۔ قمرالدین

(۱۲۰۔ لائرس چیمبرز، سپریم کورٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱)

رابطہ : غزل خانہ، پوسٹ بکس نمبر ۶۰۳۰ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

افسانہ

گھر

محمد اسد اللہ

رات ہوئی تو ہم سب کھانے پر جمع ہوئے مگر آج گھر میں روزانہ کا سا ماحول نہیں تھا۔ پتاجی کھانا کھاتے ہوئے چاچاجی سے باتیں کرتے جاتے کورٹ کچہری، کیس، تاریخیں، سودا، وکیل وغیرہ الفاظ ان کی باتوں میں بار بار سنائی دیتے مگر آج وہ تمام باتیں بند تھیں۔ بڑے چاچا محلے بھر میں سنائی دے سکے ایسی زوردار ڈکار لیتے جس پر ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے تب وہ پوچھتے ——
کیوں ہنس رہے ہو رے بچو! ایں"
چھوٹے بابو اور چاچا سر جھکائے کھانے میں مشغول تھے آج نہ بڑی چاچی سے ان کی ہنسی مذاق شروع تھی نہ ہمارے ساتھ چٹپٹی باتیں، چھوٹی چاچی کی لڑکی اونگھ رہی تھی اور وہ اسے چڑیا چڑے کی کہانی سنانے کے بجائے صرف گود میں لیے ہوئے تھیں دادی ماں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے مالا جپتی بیٹھی تھیں ہر دن کی طرح ماں اور چاچیوں کی تکرار کی روداد پتاجی کو سنا رہی تھیں اور نہ ہی بہت دیر سے انھیں اپنی نسوار کی ڈبیا یاد آئی تھی جسے میں ایک کونہ میں چھپا آیا تھا اماں خاموشی سے کھانا نکال رہی تھیں اور چھوٹی چاچی ہر روز کی طرح برتن پٹخ پٹخ کر کام کر رہی تھیں۔

ہم بچوں کو اس طرح خاموشی کے ساتھ کھانا کھانے کی عادت نہیں تھی ہم کھانے بیٹھتے تو جیسے سارا گھر گونجنے لگتا دادی ماں کہتی — میرا گھر کیسا گوکل جیسا لگ رہا ہے۔ ہاں کبھی کبھی دادی ماں یا بڑی چاچی میں جھڑپ ہو جاتی اسی وقت گھر میں ایسی خاموشی چھا جاتی مگر آج تو گھر میں ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا ہم بچوں میں بڑی چاچی کا پرشو رام بڑا تھا اسے نہ جانے کیسے بڑوں کی ساری باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے اسے اشارہ سے ایسا کیوں؟ کہہ کر پوچھا تو وہ ہماری "ف" والی بولی میں بولا —— افے تفم کفو مفا لفم نفی افے کفچھ؟ میں نے پوچھا — کفا؟ تو وہ بولا — افن کفو نفے گھفر مفے افن ہفے کفو جفا نفا ہفے"۔ پرشو نے نئے گھر کا تو ذکر کر دیا مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ نیا گھر کہاں ہے اور اس میں رہنے کے لیے ہم لوگ کب جائیں گے نئے گھر میں جانے کی خبر سن کر میں نہال ہو گیا۔

پچھلے سال راجپوت جو میرا ہم جماعت تھا مجھے اپنے نئے گھر میں کھانا کھانے لے گیا تھا۔ میں نے سوچا میں بھی اسے نیا گھر دکھاؤں گا۔ نمی" جو ہماری ف والی بولی نہیں جانتی تھی قریب آ کر پوچھنے لگی اے پرشو نے کیا کہا میں نے کہا ——
ہم کو بے ناں اب نئے گھر میں رہنے کے لیے جانا ہے"۔
"سچ"! نمی خوشی سے پھولی نہیں سمائی اور

قریب بیٹھے ہوئے گوپو اور سنیل کو بھی بتانے لگی. میں نے چاچا سے پوچھا — ہم نئے گھر میں کب جائینگے چاچا؟

ایں! وہ چونکے اور تبھی اماں زور سے گرجیں — کھا کھا الٹی سیدھی باتیں مت کر" اور چھوٹی چاچی نے پیتل کے گونڈے سے پانی نکالتے ہوئے "گھڑاک" کی آواز پیدا کی بڑے چاچا "آرام سے" کہہ کر خاموش ہوا ہے. پتاجی امّی سے بولے — "بچوں کو کیوں خواہ مخواہ ڈانٹ رہی ہو. ہاں بیٹا اب اپنے کو نئے گھر میں جانا ہے" تب ہم سب بچے نیا گھر نیا گھر کہہ کر شور مچانے لگے تب اچانک گوپو کی کہنی کے دھکے سے میرا پیالہ گر گیا اور زمین پر کیچڑ ہو گیا. چھوٹی چاچی نے دوڑ کر دو چار زوردار مکّے گوپو کی پیٹھ پر رسید کر دیئے. دادی ماں کو یہ بات پسند نہ آئی مگر نہ جانے کیوں آج انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس معاملہ میں چاچی کو کچھ نہیں کہا اور زور زور سے مالا جپنے لگیں. ورنہ ہم بچوں کی پٹائی انھیں سخت ناگوار گذرتی.

آج سب کچھ بدلا بدلا سا تھا. بہت دیر تک سب خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے رہے. کوئی کسی سے کچھ نہیں بولا. گوپو کی پٹائی کے بعد ہم سب بچے دیو سمان خاموش ہو بیٹھے.

"بہن مونگ کی دال تھوڑی اور دینا ذرا" — اس آواز پر ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں اس نے فوراً آنسوؤں کو قمیص کی آستین میں جذب کر لیا. بھابی، آج کھا لو پیٹ بھر نئے گھر میں مونگ کی دال کا سالن نہیں ملے گا. میری شادی ہوئی تب سے میں یہ پیڑ یہاں دیکھ رہی ہوں گل گیر لہجے میں یہ کہہ کر چاچی نے اپنی اشک آلود آنکھیں صاف کر لیں.

" میرا ابا پو چھوٹا سا تھا تب انھوں نے اسے لگایا تھا" دادی ماں کہنے لگیں. اور پھر بہت دیر تک پرانی باتیں سناتی رہیں کہ کس طرح ہمارے دادا نے غربت میں گذارے، کتنی مشقتیں جھیلیں اور انھیں ناگپور میں اسی گھر کو بنواتے ہوئے کتنی دقتیں پیش آئیں. دادا جان نے گھر کو کس طرح محفوظ رکھا. وہ بار بار سفیدی کراتے اور اس کے بغیر زیادہ عرصہ گذر جاتا تو دادی ماں پر بری طرح برس پڑتے. دادی ماں بتانے لگی کہ اس گھر میں کس کس کی شادی ہوئی. کون پیدا ہوا، کس کا انتقال ہوا: کون کون مہمان ہمیشہ آیا کرتے تھے. اور جب سب اکٹھا ہو جاتے تو کیسے مزے آتے. اور پھر بڑی چاچی بھی کچھ پرانی یادیں سمیٹ لائیں، کچھ بابو راؤ چاچا نے اضافہ کیا. اور ہماری اماں تو یادوں کی پکی ہیں ہی. دادی ماں تمام کھڑکیوں دروازوں پیڑ پودوں کی تاریخ بیان کرنے لگی. کون سا پودا کب لگا اور گھر میں کب بجلی آئی. کنواں کتنی بار سوکھا کتنی بار کھدوایا گیا. گائے کے کوٹھے میں ایک دن یکایک کیسے آگ لگ گئی. سب تفصیلاً سنایا. پھر آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے آنسو آنچل سے پونچھتی ہوئی بولی — گر چاچا لکشمی نانی میرے گھر آ آ کر کہتی — "تیرا گھر کیسا گول جیسا لگ رہا ہے. تیرے بچے کیسے رام لکشمن جیسے ہیں. اب کیا رہ گیا باپ کے ہاتھوں کی اتنی کمائی رہ گئی تھی وہ بھی تم نے گنوا دی. اور دادی آنچل میں منھ چھپا کر رونے لگی بڑی چاچی انھیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں. ہم لوگ کھانا ختم کر چکے تھے.

بستر پر پرشو نے بتایا کہ ہماری بہت بڑی دوکان تھی جو برباد ہو گئی اور ہم مقروض ہو گئے. اسی کا جھگڑا چل رہا تھا. اسی قرض کی ادائیگی کے لیے مکان بیچ دیا گیا. تو کیا واقعی گھر بک گیا؟ میں نے حیرت سے پوچھا. ہاں! وہ بولا — اسی لیے تو بمبئی نئے گھر میں رہنے کے لیے جانا ہے. ایک مہینے کی مدت ملی تھی اسی دوران بمبئی یہ گھر چھوڑ کر نیا گھر ڈھونڈنا ہے. اب گھر میں بھی موضوع زیر بحث تھا. شام صبح یہی چرچے ہوئے مگر شہر میں بڑا سا گھر کہیں ملتا ہی نہ تھا. شام ڈھلے چاچا گھر لوٹتے تو چاچی پوچھتی — ملا گھر؟ وہ جواب دیتے اتنی جلدی کیسے ملے گا. آج تک خود کا گھر تھا. کرائے کے مکانوں کے مسئلہ سے وہ ناواقف تھے. کہتے — اتنے سارے لوگوں کے لیے کافی ہو سکے ایسا گھر اب شہر میں ہے ہی کہاں؟ اپنے جیسا بڑا خاندان اب شہر میں ہے ہی نہیں.

اور کبھی اماں پتاجی سے پوچھتیں کہ کچھ پتہ چلا گھر کا؟ وہ جواباً کہتے ہاں ہے مگر اتنا بڑا کہاں ہے؟ پھر آفس بھی اس سے بہت دور ہے. اور کبھی چھوٹی چاچی چاچا کو علیحدگی میں لے جا کر سمجھاتی — بڑے گھر کے چکر میں کیوں پڑتے ہو. خود کا گھر تو تمہارے بھائیوں نے اجاڑ ڈالا. اب ایک ساتھ رہ کر کیا کریں گے. وہ کہتے — ارے بھئی مگر ماں کو کیا لگے گا؟

اونھ! انکا کیا ہے خود کا گھر ہے تو ایک ساتھ رہتے تھے اب نہیں ہے تو کیا رہیں مجھے تو ساتھ میں رہنے سے کوئی نہیں ہمارے یہاں بمبئی میں ایک کمرہ میں سارا گھر رہتا ہے. تم بھی ایک دو کمرے دیکھو نا وہاں سے تمہیں آفس بھی قریب پڑے گا. چاچا اس بات میں سر ہلا دیتے تو چاچی خوش ہو جاتی. مگر دادی ماں خاموش تھیں. گھر ملا، نہیں ملا کبھی بھول کر بھی کسی سے پوچھا نہیں بلکہ اب انھوں نے صبح کا کھانا بھی چھوڑ دیا تھا. بس ہر دم مالا جپتی رہتیں بیچ بیچ میں ڈبڈبائی آنکھیں صاف کرتی رہتیں. اب پڑوسی آہ کر گھر کے بارے میں پوچھتے جھوٹی ہمدردی جتاتے. دادی مطلق خاموش رہ رہتیں. سب کہتے دادی ماں کے دل پر کسی بات کا گہرا صدمہ پہنچا ہے. پرسوں رات گئے. پتاجی گھر آئے اور اکیلے ہی کھانا کھانے بیٹھے. میری نیند اڑ چکی تھی کمرہ میں تنہا ڈر بھی لگ رہا تھا میں نے سنا ماں پتاجی سے

کہہ رہی تھی — بڑی بی کی طبیعت اب کچھ ٹھیک نہیں رات میں اٹھ اٹھ کر ساری دیواریں ٹٹولتی پھرتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے . . . . . .

کیا؟ پتاجی نے پوچھا۔

کہیں کسی دیوار میں ماماجی کے ہاتھوں کا کچھ سونا وغیرہ تو چھپا ہوا نہیں۔ پتاجی ہنس پڑے بولے — کہاں کا سونا چاندی بڑھیا کا سارا دل گھر کے ایک ایک اینٹ پتھر میں اٹکا ہوا ہے۔ اور پھر ماں کو پرانی باتیں بتاتے بتاتے ان کا لہجہ گلوگیر ہو گیا کہ دادی کو گھر کی ایک ایک چیز کتنی عزیز ہے ان در و دیوار سے اسے کتنی شدید محبت ہے۔

ایک ماہ کی میعاد ختم ہونے کو آئی مگر کوئی بڑا گھر ابھی تک نہ مل سکا۔ ایک دن بابوراؤ چاچا نے بتایا کہ انھیں بردی پر دو کمرے مل گئے۔ پتاجی نے بھی کہیں دو کمرے حاصل کر لیے اور بڑے چاچا بھی عنقریب کسی چال میں رہنے کے لیے جانے والے تھے کمرے ملتے ہی گھر میں ہر دن شورشیں شروع ہو گئیں سامان کی تقسیم ٹھیک طرح نہیں ہو پا رہی تھی چھوٹی چاچی خوب زور زور سے جھگڑتی اور اب کھانے کے لیے بھی سب الگ الگ بیٹھنے لگے تھے۔ بڑوں کے جھگڑے ہماری سمجھ سے باہر تھے مگر ہمارے درمیان بھی روزانہ دو چیزوں کا بٹوارا ہوتا۔ ایک دادی ماں اور دوسرے طوطا ہر کسی کو یہ دونوں چیزیں اپنے گھر چاہیے تھیں ہماری بھی تقسیم نہیں ہو پائی۔ خوب لڑائیاں ہوتیں آخر ہم دادی ماں کے پاس جاتے اور پوچھتے — دادی ماں تو کس کی؟ مگر دادی ماں ہر کسی سے کہتی — بیٹا میں تیری ہی ہوں رے ——

مگر ہمیں اطمینان نہ ہوتا بلکہ جھگڑے میں اور زور پیدا ہوتا تب دادی ماں جھلا کر کہتی۔ کمبختو! آج تک اس گھر میں کوئی لڑا نہیں۔ اب دیکھو تو روز روز جھگڑے ہو رہے ہیں۔ جیسے بڑے ویسے چھوٹے۔ سونا چاندی تو سارا چلا گیا۔ ایک میں بچی ہوں میرے بھی ۲ ٹکڑے کر کے بانٹ لو۔ تب ہم خاموش ہو جاتے مگر پھر ہماری دادی ماں ہماری دادی ماں کہہ کر لڑ پڑتے۔

ہماری ہی طرح یہ جھگڑا بڑے لوگوں میں بھی چلتا چھوٹی چاچی کہتیں۔ بڑی بی ہمارے پاس رہ جائیں مگر ہمارے یہاں دو ہی کمرے ہیں۔ ان کی پوجا پاٹھ مشکل ہو جائے گی اماں کہتیں ہمارے پاس رہ جائیں مگر ہمارا گھر دوسری منزل پر ہے زینوں سے اترنا چڑھنا بھلا ان سے کیا ہو گا۔ بڑی چاچی بولیں۔ ہمارے پاس رہ جائیں مگر ان کا دل تو بابوراؤ جی میں اٹکا ہوا ہے۔ ہر دو دن کے بعد کہیں گی مجھے بابوراؤ کے پاس پہنچا دو۔ دادی ماں یہ ساری باتیں سنتیں مگر ایک لفظ نہ کہتیں۔

آج دوپہر کو نئے گھر جانا تھا۔ بڑی بڑی چیزیں جس کی تھی وہ لے گیا صرف کھانے کے برتن اور چھوٹا موٹا سامان باقی بچا تھا۔ اسے بندھوانے کے لیے وقت ملنا چاہئے اس لیے صبح کا کھانا جلد ہی کھا لیا گیا۔ ہم سب بچے بابوراؤ چاچا کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ بابوراؤ چاچا گھر کے سارے کیلے، کھڑکیوں کے شیشے، کھونٹیاں الماریوں کے کواڑ، ٹین کے ڈبے جو کچھ نکالا جا سکتا تھا نکال رہے تھے۔ جس کی وجہ سے دیواریں خراب ہو رہی تھیں۔ پلاسٹر اکھڑ رہا تھا۔ مگر انھیں اس کی پرواہ کب تھی۔ البتہ دادی ماں انھیں بار بار منع کر رہی تھیں کہ وہ دیواریں خراب نہ کریں مگر وہ نہ مانتے اسی دوران انھوں نے ہمیں کیلوں کے ۳ حصے کرنے کے لیے کہا۔ مگر پرشو نے ایک کیلا زیادہ لے لیا جس کے لیے چھوٹی چاچی نے پرشو کو خوب باتیں سنائیں اسی بات پر بڑی چاچی سے ان کا جھگڑا بھی ہوا۔ بڑی چاچی نے پرشو کو بری طرح پیٹ کر اسکے سارے کیلے چھین کر گوپو کے منہ پر دے مارے پرشو روتا ہوا دادی کے پاس گیا مگر دادی نے اسے قریب نہیں لیا بلکہ خود ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہمیں اندر ہی اندر کچھ عجیب سا لگا۔

سارا گھر خالی ہو گیا۔ ہم بولتے تو ہماری آواز سارے گھر میں گونجنے لگتی ہمیں مزہ آتا ہم خوب چلانے لگے۔ اوپر کمروں میں کچھ رہ گیا یا نہیں یہ دیکھنے کے لیے ہم اوپر پہنچے تو دیکھا تمام کمرے خوف ناک حد تک اجاڑ ہو چکے تھے سب سنسان ہو چکا تھا۔ کسی دیوار پر کوئی کیلا کوئی کھونٹی تک باقی نہیں بچی تھی الماریوں اور دروازوں سے کواڑ تک غائب تھے ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ صرف ایک آئینہ جس میں جگہ جگہ بال اتر آتے تھے۔ دیوار میں جڑا ہوا تھا۔ اس آئینے میں ایک آدمی کے کئی کئی چہرے نظر آتے تھے۔ آئینے میں جھانکتے ہوئے بابوراؤ چاچا بولے —

جاؤ بچو! ذرا سبل لے آؤ۔ ہم سبل لے آئے تو وہ دیوار پھوڑنے لگے جس کی آواز سن کر دادی ماں اوپر آئیں۔ زینہ چڑھتے ہوئے ان کی سانس بھر آئی۔ ان سے ٹھیک طرح بولا بھی نہ جا رہا تھا بڑی مشکل بولیں۔

بابوراؤ! ارے دیوار گر جائے گی نا۔

کچھ نہیں ہو گا ماں تو نیچے جا۔

ارے میرے لال سن، میری قسم تجھے دیوار گر جائے گی تو اس آئینے کا کیا کرے گا دیکھ دیوار گر جائے گی۔

گرنے دو اب یہ گھر ہمارا تھوڑا ہی ہے

ارے واہ! اتنے دن اس کی چھاؤں میں نکالے اور اب اسکا تیرا کچھ نہیں کوئی رشتہ نہیں مگر بابوراؤ چاچا نے ایک نہ سنی اور آئینے کے چھوٹے ٹکڑے کھود کر نکال لیتے۔

بہت دنوں بعد ہم سب کھانا کھانے کے لیے اکٹھے بیٹھے تھے مگر پھر بھی آپس میں کسی قسم کی بات چیت نہیں ہوئی۔ ہر سنیچر کو ایک غریب لڑکا بین ہمارے یہاں کھانا کھاتے

آیا کرتا تھا۔ آج وہ بھی چپ تھا۔ ورنہ عام طور پر اس کی زبان ایک منٹ نہ رکتی مونگ پھلی کی دال کا سالن آج شاندار بنا تھا۔ چھوٹی چاچی بہن سے بولیں۔ تجھے کہا تھا نا کہ کھانا کھانے اب اگلی بار کسی دوسرے کے یہاں جانا کیا کوئی دوسرا گھر نہیں دیکھا دیکھ تو رہا ہوں مگر ابھی ملا نہیں۔

بہن بولا اور تبھی دادی ماں بری طرح جھلاّ گئیں۔ کیوں! دس آدمیوں کے گھر میں ایک برہمن کا بچّہ نہیں پل سکتا۔ ہمارے گھر میں کئی کئی لڑکے کھایا کرتے تھے تم پر ایک بچہ بوجھ ہو گیا؟ دادی ماں کے اس سوال پر سب خاموش رہے۔ ماں نے بھی بہن کو دوسرے کے گھر جانے کے لیے کہہ دیا۔ دادی ماں چپ چاپ دروازہ میں بیٹھی رہیں۔ اور ہم سب کو بہت دنوں بعد اکٹھا کھاتے ہوئے ٹک لگائے ہوئے عجیب نظروں سے دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر بتاجی سے بولی۔ تم نے سارا سامان اکٹھا کر لیا مگر آنگن میں تلسی کا ورنداون کیوں چھوڑ دیا؟

اس پر باپوراؤ چاچا درمیان ہی بول پڑے۔ تم بھی خوب ہو ماں دو کمروں کے گھر میں اسے کہاں رکھیں گے؟

کہیں بھی رکھ۔ مگر کیا گھر میں تلسی نہیں چاہئے۔ میں نے اتنے دن۔۔۔۔۔۔

اونہ جانے دو ماں مٹی پتھر کا بوجھ تجھ سے چھوٹتا ہی نہیں باپوراؤ چاچا کے کہنے پر دادی ماں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

کوئی ۳ بجے باپوراؤ چاچا تانگے لے آئے باقی بچا ہوا سامان ان میں رکھ دیا گیا۔ منوّ دیدی سسرال جاتے وقت جس طرح روتی تھیں سب لوگ رو رہے تھے مگر ماں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بڑی چاچی کے پاس کی لٹیا بھی غائب تھی۔ سب پریشان تھے دادی ماں کہاں ہے دادی ماں کہاں ہے۔ کہہ کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ بتاجی کسی انجانے خوف سے گھر کے کنویں میں بھی جھانک آئے۔ آخر باپوراؤ چاچا اوپر بلڈنگ پر گئے اور پانچ دس منٹ بعد لوٹے تو ان کے ایک ہاتھ میں چاچی کی پانی لٹیا تھی اور دوسرے ہاتھ سے دادی ماں کا مٹی گارے میں سنا ہوا ہاتھ جسے تھام کر وہ نیچے اتر رہے تھے۔ دادی کا سارا جسم مٹی اور گارے سے سنا ہوا تھا۔ چاچی نے دادی کا یہ حلیہ دیکھا تو پوچھا۔ یہ اوپر کیا کر رہی تھیں؟ باپوراؤ چاچا بولے ——

عجیب پاگل پن ہے جس دیوار سے آئینہ نکالا وہ جگہ اکھڑی ہوئی تھی اس کو گارے سے لیپ رہی تھیں۔ بتاجی بولے۔ کیسی ہے ماں تو۔۔۔۔۔۔۔۔اب اس گھر سے ہمیں کیا لینا دینا۔

نیچے تانگے والے جلدی چلنے کے لیے شور مچا رہے تھے "جلدی چلو۔ جلدی چلو"، ماں نے فوراً دادی کے ہاتھ دھلوائے ہم تانگے میں جا بیٹھے۔ دادی ماں کی تمنّا تھی کہ باپوراؤ چاچا کے ساتھ جائیں اور ان ہی کے وہاں رہیں مگر وہ خاموش رہے بڑے چاچا نے دادی ماں کو اپنے تانگے میں لے جا کر بٹھایا۔ دادی ماں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ پڑوسی دری جوں دروازوں میں سے جھانک جھانک کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔

تانگے والوں نے فضا میں چابک لہراتے اور ہمارے تانگے تین سمتوں میں چل پڑے دھیرے دھیرے ہمارا گھر ہماری نظروں سے دور ہوتا گیا۔ (مراٹھی سے ترجمہ)

ایک تاریخ ساز دستاویز

کالم نگار نمبر

مرتّب: فکر تونسوی

معاونین: بشیر احمد۔ انیس احمد خاں

• ابتدا سے آج تک کے اُردو کالم نگاروں کی

تخلیقات کا انتخاب

ان کی تصاویر، کارٹون اور سوانح پانچ سو سے زیادہ صفحات کی کتابت ہو چکی ہے۔

قیمت: نٹو روپے

پتہ: چنگاری ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

افسانہ

نیاز احمد اعظمی

دوسرا رُخ

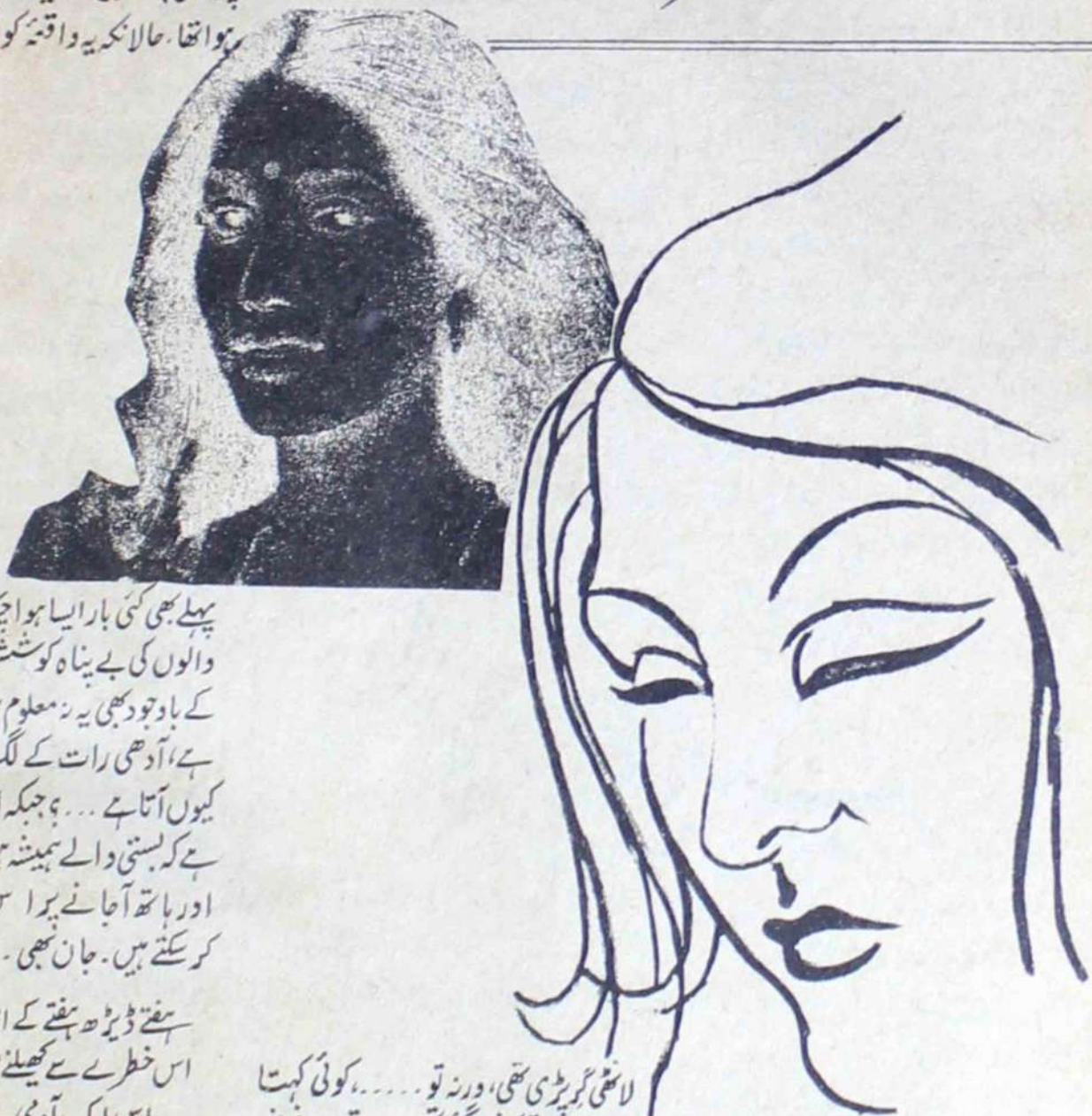

وہ بھاگ رہا تھا۔ لوگ پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے، بالکل ایسے ہی جیسے شکار کے پیچھے شکاری۔ لیکن وہ بہت دور نکل چکا تھا، اور لوگ بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ لہٰذا لوگ لاٹھی ڈنڈا سنبھالتے ہوئے واپس ہولیے ــــ کوئی کہتا بس قدم دو قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا، ورنہ تو ..... کوئی کہتا میری لاٹھی گر پڑی تھی، ورنہ تو ..... کوئی کہتا میری دھوتی پھنس گئی تھی، ورنہ تو ..... غرض یہ کہ ہر کوئی ناکام شکاری کی طرح اپنی اپنی ڈینگ رہا تھا۔

پوری بستی میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگ مکھیا جی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے اپنے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے آپ کو بہت بہادر اور عقلمند ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگوں کی بہت سی باتیں ابھی ادھوری تھیں، لیکن لوگ ہارے ہوئے جواریوں کی طرح اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے، کیونکہ رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔

رات کا واقعہ پوری بستی (اور پاس پڑوس) والوں کے لیے گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ واقعہ کوئی نیا نہیں تھا، پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ لیکن بستی والوں کی بے پناہ کوششوں اور چھان بین کے باوجود بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کون ہے، آدھی رات کے لگ بھگ بستی میں کیوں آتا ہے ..... جبکہ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ بستی والے ہمیشہ ہوشیار رہتے ہیں، اور ہاتھ آجانے پر اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ جان بھی ..... پھر بھی وہ ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے اندر بے خوف و خطر اس خطرے سے کھیلنے ضرور آتا ہے۔

اس ایک آدمی نے پوری بستی والوں کو اس قدر پریشان و خوف زدہ کر رکھا تھا کہ پہرا دینے والوں کے علاوہ بھی لوگ آنکھوں میں نیند ٹھس جانے کے باوجود آنکھیں کھلی رکھتے، کہ نہ جانے کب وہ آئے اور کیا کر جائے۔

بستی میں اس سلسلے میں اکثر پنچائتیں بھی ہوتیں، لیکن مسئلہ ایک قدم بھی آگے پیچھے نہ ہوتا ــــ مگر ایک دن بستی کا نائی گھر گھر کا پانی پینے والا، حقیقت کے ایک دروازے تک پہنچ ہی گیا۔ اس کی اطلاع

کے مطابق یہ آدمی کوئی چور ڈاکو، کوئی پاگل یا وحشی نہیں، بلکہ ایک عاشق ہے۔ جو بستی میں کسی سے پیار کرتا ہے۔ لیکن اسکے بارے میں مزید کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کون ہے کہاں کا ہے، کس سے پیار کرتا ہے۔

لہٰذا بستی کی تمام پر پھڑپھڑاتی ہوئی کنواریوں کو گھروں کی چہار دیواریوں میں قید رکھنے کا قانون لاگو کر دیا گیا۔ اور انکی نگرانی کا بھی کڑا انتظام کر دیا گیا۔ حالانکہ اس قانون سے مزدوری کر کے گذر بسر کرنے والے غریب اور چھوٹے لوگوں کو تکلیف تھی، ان کا نقصان تھا۔ کیونکہ ان کی بہو بیٹیاں گھر کے کام کاج کے علاوہ باہر بھی ان کے ساتھ کام کیا کرتی تھیں۔ پھر بھی وہ اس قانون پر عمل کرنے کے لیے مجبور تھے، کیونکہ یہ مکھیا اور بستی کے کچھ بااثر لوگوں کا لاگو کیا ہوا قانون تھا وہ بھی خاص طور سے ایسے ہی لوگوں کے لیے۔

مگر جیسے جیسے یہ قانون پرانا ہوتا گیا، ویسے ویسے کمزور ہوتا گیا۔ مکھیا کے پاس کچھ شکائتیں بھی آنے لگیں۔ مثلاً فلاں کی بیٹی یا بہو گھر کے باہر فلاں جگہ فلاں کام کرتے ہوئے دیکھی گئی۔ لہٰذا مکھیا نے ایک دن ایسے تمام لوگوں کو بلالیا اور ان سے کچھ دریافت کئے بغیر ہی ان پر برس پڑے —— "سالو، کمینو، ذلیل۔ بستی کی عزت کو مٹی میں ملانا چاہتے ہو۔ اپنی اپنی لڑکیوں کو تم لوگوں نے گھروں سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ آخر تم چھوٹے اور بے عزت لوگوں نے اپنی اصلیت کا ثبوت دے ہی دیا۔ اپنی اوقات پر آہی گئے۔ اگر تم لوگوں کو اپنی اپنی لڑکیوں پر اتنا اختیار و قابو نہیں رہا تھا تو انہیں کوٹھوں پر کیوں نہیں بٹھا دیتے —— کان کھول کر سن لو اگر پھر ایسی شکایت میرے پاس آئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

بے گناہ، بے بس و مجبور مجرم مکھیا کی عدالت سے چپ چاپ فیصلہ سن کر سر جھکائے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو آگئے۔

دوسرے دن پوری بستی (اور پاس پڑوس) میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھی کہ مکھیا کی جوان بیٹی نہ جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی۔

بقیہ تخلیق بہ مقابل تنقید

کے رویے اکثر MALE CHAUVINISM کی غمازی بھی کرتے ہیں اور ایک عجیب سا رویہ یہ ہے۔ مثلاً کشور ناہید کے نئے شعری مجموعے کے گرد پوش پر انور سجاد شاعری پر اظہار خیال کرنے کے بعد آخری جملہ یوں لکھتے ہیں "وہ پکوڑے بھی اچھے بناتی ہے"۔ یہ کیا بات ہوئی۔؟

جواب ۴ـ

نقاد خالص معروضی تنقید بھی کر سکتا ہے اور فیصلے بھی (گو بعض ناقدین فتوے صادر کرتے ہیں) مگر اکثر اوقات فیصلے صادر کرنے والے آزاد نقاد اور مارکس وادی فیصلہ جاتی تنقید کرنے والے ادبی کو معیار میں شاید زیادہ فرق نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں "قومی تشخص" پر اصرار کرنے والے آج کے پاکستانی نقاد بھی تو ان دنوں CATEGORIES قائم کر کے ان کے مطابق ادب کی چھان پھٹک میں مصروف ہیں۔ کیا انہیں ناقدین کے زمرے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔؟

جواب ۵ـ

نقاد یقیناً میری تخلیقات کو مسترد کر سکتا ہے جس طرح مجھے حق ہے کہ میں جو چاہوں اور جس طرح چاہوں لکھتی رہوں۔ اسی طرح نقاد کو حق حاصل ہے کہ وہ مجھے مسترد کر دے۔ ادب تو جناب عالی بالکل آزادی کا معاملہ ہے۔ لیکن مجھے علم نہیں کہ آج تک کسی لکھنے والے نے نقادوں کی دہشت میں لکھنا چھوڑ دیا ہو۔

دراصل اکثر ناقدین کے ہاں ان کے ذاتی یا نظریاتی تعصبات بھی کارفرما رہتے ہیں۔ اور ان کے اپنے اپنے FAOS ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اقبال کے قائل نہیں۔ وزیر آغا ہر جگہ کھینچ تان کر زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔ وارث علوی کا خیال ہے جب تک وہ ہر صفحے پر چند مغلظات استعمال نہ کر لیں گے ان کی بات میں وزن نہیں پیدا ہوگا۔

دراصل تخلیق کار اور نقاد کا معاملہ ان کی انانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ادیب یا شاعر سمجھتا ہے کہ اس کی تخلیقات کی اساس پر ہی ناقد اپنی دکان چمکاتا ہے۔ کچھ ناقدوں کو زعم ہے کہ وہ گویا ادب کے KING MAKER ہیں۔ میں نے بہت سے مشہور اہل قلم کو مشہور ناقدین کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہے۔ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ "فلاں فلاں کو ANTAGONISE مت کیجئے آپ کے خلاف لکھنا شروع کر دینگے"۔ کمال ہے۔

یوں تو شاید آپ کو یاد ہوگا ہی سارتر ناقدین کے بارے میں کیا کہہ گئے ہیں۔ شکریہ

بقیہ معروضی تنقید

ساخت اور مزاج کے دائرے میں ہی ممکن ہے۔ اسلوبیات کا انداز فکر معروضی

، اور صریحی ،

ہے۔ کسی ادبی تخلیق کے اسلوبیاتی مطالعے کے وقت ماہر اسلوبیات متن سے باہر کی چیزوں مثلاً زمان و مکان یا ادیب کی شخصیت کو نظر انداز کرتا ہے اور صرف اس ادبی تخلیق پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ جو زبان اور شاعر یا ادیب کے اسلوب کے دائرے میں بندھی ہوتی ہے۔

لہٰذا عصر حاضر میں اس اردو ادبی تنقید کو جس کے بارے میں کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ "یہ محض فرضی ہے۔ یا اقلیدس کا خیالی نقطہ یا معشوق کی موہوم کمر" سائنٹفک بنانے کی ضرورت ہے۔ لسانیاتی اصولوں اور ادبی تنقید کی ہم آہنگی ہی معیاری تنقید کی بنیاد ثابت ہو سکتی ہے ——

سُخن در سُخن

٭ ادب کے نام پر بے ادبی۔

٭ ساقی فاروقی کا خط۔

٭ غائبانہ تقریبِ رونمائی

پچھلے ہفتے ہم نے افتخار عارف اور ساقی فاروقی کے درمیان معرکہ آرائی کی طرف اشارہ کیا تھا اور یہ اطلاع دی تھی کہ اوّل الذکر کے نام ثانی الذکر نے ایک طویل اور سنسنی خیز خط لکھا ہے۔ حال ہی میں کراچی کے متعدد ادیبوں کو اس خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں موصول ہوئی ہیں اور اب بعض لوگ اس خط کے مزید عکس بنوا کر تقسیم کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی ایک کرم فرمانے اس خط کا عکس عنایت کیا ہے جسے پڑھ کر ہمیں کاتب اور مکتوب الیہ دونوں کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی۔ کاتب سے اس لئے کہ اب تک انہوں نے شاعری کر کے خوامخواہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو زحمت دی اگر وہ شروع ہی سے نثر کی طرف توجہ کرتے تو خاصے کامیاب رہتے مکتوب الیہ سے اس لئے ہمدردی پیدا ہوئی کہ ان کے مجموعے کی رونمائی سے پہلے خود ان کی اپنی رونمائی ہو گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس خط میں افتخار عارف کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا کوئی دستاویزی ثبوت پیش نہیں کیا گیا اور جو لوگ افتخار عارف کو قریب سے جانتے ہیں وہ اس خط کا کوئی خاص اثر نہیں لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ان پر غنودگی طاری ہو جائے گی اور غنودگی کا کیا ہے۔ وہ تو ساقی فاروقی کا خط پڑھے بغیر بھی طاری ہو سکتی ہے۔

ہم نے گزشتہ ہفتے قارئین کرام سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ساقی کا خط ہمارے پاس آیا تو ہم اسے اپنے کالم میں شائع کریں گے بشرطیکہ اس سے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس کی خلاف ورزی نہ ہو۔ یہ خط اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ ۲۶ صفحات پر اسی طرح پھیلا ہوا ہے جس طرح ساقی کی شاعری ۲۶ برسوں میں پھیلی یا سمٹی ہوئی ہے۔ اس خط کا بڑا حصہ مذکورہ آرڈی نینس ہی کے نہیں، حکیم محمد سعید کے آوازۂ اخلاق کے بھی خلاف ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ناقابل اشاعت ہی نہیں ناقابلِ مطالعہ بھی ہے کیونکہ ساقی نے افتخار عارف پر وہ تمام الزامات لگائے ہیں جو سیاستدان یحییٰ خان پر لگاتے ہیں اور یحییٰ خان سیاستدانوں پر لگایا کرتا تھا۔ سیاستدان بھی سچے تھے اور یحییٰ خان بھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساقی اور افتخار دونوں سچے ہیں کیونکہ جب تک افتخار کا جوابی بیان سامنے نہیں آجاتا، اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ سچ کس کے ساتھ ہے۔ فی الحال تو سچ ہمارے ساتھ ہے کہ ہم دونوں کے بارے میں ایک جیسی رائے رکھتے ہیں یعنی غیر جانبدار ہیں۔ ذیل میں ہم ساقی فاروقی کے خط کے وہ حصے شائع کر رہے ہیں جو نسبتاً بے ضرر ہیں۔ املا کی غلطیاں ہم نے درست کی ہیں۔ مطالب کی غلطیاں افتخار عارف درست کر لیں گے یا وہ لوگ جن کے نام اس خط میں آئے ہیں۔ ہم نے اس خط کی بہت سی عبارتیں حذف کر دی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اتنا طویل خط نہیں چھاپ سکتے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں بعض پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ فحاشی سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں، جو الفاظ یا جملے ہم نے حذف کئے ہیں، ان کی جگہ نقطے درج کر دیئے ہیں۔ پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ خالی جگہوں کو قیاسی طور پر پُر کرنے کی کوشش میں وقت ضائع نہ کریں بلکہ خط لکھ کر ساقی فاروقی سے خط کا مکمل عکس منگوا لیں۔ ہمیں ساقی فاروقی کا پتہ معلوم نہیں۔ انہیں افتخار عارف (اردو مرکز لندن) کی معرفت خط لکھا جا سکتا ہے۔

اس خط کی اشاعت سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ کاتب اور مکتوب الیہ کو رسوا کیا جائے کہ یہ کام متعلقہ حضرات ہم سے بہتر انجام دے سکتے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ انجام دے چکے ہیں۔ اس کی اشاعت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہمارے ادیب اپنا وقت کن غیر مفید کاموں میں صرف کر رہے ہیں۔ ادب کے نام پر اس بے ادبی کا کوئی جواز نہیں۔

ایک بات ہمیں ساقی فاروقی سے بطور خاص یہ کہنی ہے کہ جب آپ نے افتخار عارف سے دوستانہ مراسم قائم کئے تھے تو اس کی اطلاع آپ نے کسی کو نہیں دی تھی، اب تعلقات خراب ہوئے ہیں تو آپ اس کی اطلاع دوسروں کو کیوں دے رہے ہیں۔

دوسری بات ہم افتخار عارف سے کہنا چاہتے ہیں کہ ساقی کے خط سے پریشان ہو کر آپ اپنی کتاب کی رونمائی کا پروگرام منسوخ یا ملتوی نہ کیجیے گا۔ یہ تقریب ضرور ہونی چاہیئے۔ سنا ہے کہ اس موقع پر آپ کراچی نہیں آئیں گے۔ آپ آیئے اور شرکت کیجئے اور دیکھئے کہ کس دھوم دھام سے تقریب ہوتی ہے۔ آپ کی شرکت اس لئے بھی ضروری ہے کہ غائبانہ تقریبِ رونمائی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔

اب آپ ساقی کا خط پڑھئے:

عزیزی افتخار عارف! یہ خط لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ہندوستان سے "ن" (نارنگ) کا خط آیا کہ تمہیں معاف کر دوں۔ لندن کے "ن" نے بتایا کہ تم میرے گھر آ کر معافی مانگنے پر تیار ہو مگر خوف ہے کہ کہیں مار کر بھگا نہ دوں۔۔۔۔۔ گویا یہ کہ میں ایک شمشیر برہنہ ہوں نہ مجھے اپنی طبعی یا شعری بزرگی کی فکر ہے نہ اخلاق، تہذیب و مروت وغیرہ سے غرض ہے۔۔۔۔۔ دو تین اُڑ لوگوں سے پتہ چلا کہ میں تم سے خفا ہوں۔ جب پتہ چلا کہ تم اپنی مدافعت کی تیاری کر رہے ہو کہ کہیں مجھے۔۔۔۔۔۔ نے وہ سب باتیں بتا تو نہیں دیں جو تم حسبِ فطرت کہتے یا کرتے رہتے ہو تو تم غلط نہیں سمجھ رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ اطہر نفیس کا خط (اس لڑکے کا خیال رکھنا) ـــــ جو تم نے بھجوایا تھا یا سلیم احمد کا خط ـــ ("یہ لڑکا تم سے بہت مرعوب ہے اس کا اسی طرح خیال رکھنا جیسا شمیم کا") یا تمہارا ادلیس کارڈ، بنک کے ایک پرچے پر کہ "آپ ہی اس شہر کے قطب ہیں اور یہاں کون ہے"۔ پھر لنگ کے لئے گاجے گلے چاکلیٹ لانا، گنڈی بھابھی کو عید کارڈ بھیجنا بلکہ پھول بھی ـــ ان چیزوں کے باعث میں نے تم کو ایک طرح کی PROTECTION دے رکھی تھی۔ پھر اپنا دیوان جو تم نے مجھے دیکھنے کے لئے دیا تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ "ساقی بھائی کے لئے برائے اصلاح" اور میں نے اپنے حساب سے کافی کٹ چھانٹ بھی کر دی تھی، کچھ مصرعے اور شعر بدل دیئے تھے، کچھ کا وزن

بھی تحفظ کر دیا تھا۔ دوسروں کے شعر در مصرعے جو اس میں درآئے تھے وہ بھی کاٹ دیئے تھے ...... پھر شروع کے دو سال تک ؟ لندن میں جو غزلیں تم کہتے تھے، ٹیلیفون پر سناتے تھے میر تم سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ وہ تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان اور خوبصورت ہے۔ میں دکھی ہوئی ہر طرح بااصول دشوارے کے ...... ایک خوشخط رکھ دیا تھا۔ وہی تم اب کھا گئے ہو۔

جب رستہ ہو ... کرنا بھی فرض تھا۔ مگر ان بیٹھے ہوئے میں نے PROTECTION ... شادی کر کے اس میں سموئے ہوئیں کہ دل بجھ گیا۔ تم کو کیسے بتاؤں تمہاری شخصیت کے برے پہلوؤں پر گئی۔ ... کر چکا ہوں اور تمہارا یہ جواب سنا کہ "میں وزن میں رہنے کی وجہ سے ہر ایرے غیرے ...... کو خوش کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ جاتے جاتے جائے گی ...... مگر اب محسوس کرتا ہوں کہ وہ عادت تو دوسروں کے درمیان شک، رنجش وغیرہ پیدا کرنے لگی ہے اور تم بالکل جان بوجھ کر دوسروں کے تعلقات اور اپنی شخصیت کو مجروح کر رہے ہو۔ اب جو کچھ لکھنے جا رہا ہوں وہ ایک طرح کی وارننگ ہے، اور کسی بات کا جواز کسی کے سامنے پیش نہ کرنا۔ بوکھلانا بھی نہیں کہ ہر بات کے زندہ گواہ لندن، لاہور اور کراچی میں موجود ہیں، کچھ تحریریں، تحریریں میرے پاس موجود ہیں، کچھ اور لوگوں کے پاس۔ صرف ایک صورت ہے کہ اپنے کو ... بیاد دو مرہت منا اور بت ٹوٹ جاؤ گے۔ شاید تمہیں ہوش ہی نہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ ذرا دیکھو تو ....

جب میں نے ایک جلسے میں فیض صاحب سے ایک نظم کی فرمائش کی اور ایک مقام پر کہا کہ "بس فیض صاحب نظم یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ آگے مت پڑھیے" اور فیض صاحب رک گئے۔ یہ ان کی بڑائی بھی تھی اور میری جرأت کے ایک معنی بھی بنتے تھے۔ پھر محمد علی صدیقی شہرت ...... فراز نے کہا کہ پڑھنے دو یار۔ سب نے کہا واہ تمہارے۔ مگر تم نے وہ کام کیا جس کے لئے مشہور ہو۔ دوسرے دن حبیب حیدرآبادی ...... کو فون کر کے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ "کن کن لوگوں کو آپ گھر پر بلاتے ہیں۔ یہ اس "کن کن" کا ذکر تھا جو ایک طرف کلام کی اصلاح بھی کر رہا تھا اور جس کو "بھائی بھائی" کہتے تمہارے منہ سے جھاگ نکلا کرتا ہے اب بھی۔ پھر جب میں خفا ہوا تو مجھے فوراً تم نے بتایا کہ "یہ جھوٹے ہیں کہ وہ کم ظرف لوگ ہیں" اکبر حیدرآبادی نے فون کیا انہیں خود آ میرا انٹرویو سنایا، وہ جتایا کہ میں نے ... کا نام لیا ہے۔ یہ میں نے بتایا کہ انٹرویو چھپتے ہی میں نے تمہیں اور پھر ہیت کو فون کر کے کہا تھا کہ یہ دو باتیں غلط ہو گئیں۔ ایک یہ کہ نقالوں نے انیس ناگی کی شاعری کی تعریف کر دی۔ دوسرے یہ کہ اکبر کا نام انہوں نے نہیں چھاپا۔ پھر عبداللہ حسین نے بتایا کہ تم ان سے ... عارف نے فون پر تمہارا ایک انٹرویو پڑھ کر سنایا جس میں تم نے کہا کہ یوسفی، ہیت، زہرہ نگاہ

اور عارف کے علاوہ نہ میں کسی سے ملنا چاہتا ہوں نہ کسی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ تمہاری اختراع اور سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ میں نے جب عبداللہ حسین کو اپنے یہاں بلایا اور شہرت کے سامنے اصل جملہ سنایا تو اس کے اوسان جاتے رہے کہ "ملنا اور دیکھنا" تو انٹرویو میں بے ہی نہیں ......

ایک طرف مجھ سے کہتے ہو کہ میں تمہیں انگریزی پڑھا دوں کہ تمہیں نہ انگریزی لکھنی آتی ہے نہ پڑھنی۔ انگریزی نظمیں سمجھا دیجئے پھر میرے دوست سلیم احمد کے بارے میں تمہارا یہ جملہ "یہ ...... انگریزی مصنفوں کو کوٹ کرتے رہتے ہیں، انہیں انگریزی لکھنی تک نہیں آتی ...... اپنی "بھیا" زہرا نگاہ کو خوش کرنے کیلئے دھڑا دھڑ کشور ناہید کی شاعری کی تباہی اور ان کی نثری نظموں پر ایسا قہقہہ مارتے تھے کہ میرے تو حواس جلتے رہتے تھے اور تمہارا خیال ہے ایسی باتوں سے بھیا خوش ہوتی ہیں؟ پھر اپنی انہیں بھیا کے بارے میں ارشاد کہ "ساقی بھائی اگر آپ کے ان سے ذاتی تعلقات نہ ہوتے تو کیا آپ مضمون لکھتے؟" مگر تمہارا اصلی رخ یہ کہ تمہاری فرمائش پر میں نے تمہارا دیباچہ لکھنے میں ٹال مٹول کی۔ تمہیں بتاؤ کہ اگر اس کلیشے بھرے کلام پر لکھتا تو کیا تمہارا دل نہیں ٹوٹتا۔ یہ کیسی شاعری ہے جس سے میر آنیس اور مشہور ہوگئے۔ شکایت کی تم نے پروین شاکر کی تمہارا ایک شعر لے اڑیں۔ میر انیس کس سے شکایت کریں گے ......

تمہیں یاد ہے پروین شاکر والے شعر پر یوسفی صاحب کے یہاں میں نے کیا کہا تھا "اختیار وہ شعر اتنا ذلیل ہے کہ جس نے لکھا ذلت اٹھائی" پھر یوسفی صاحب نے (چونکہ صاحب علم و صاحب نظر ہیں) تمہیں غلط مشورہ نہیں دیا تھا کہ صاحبزادے اپنا راستہ ایک کر لو یا غزل لکھو یا مرثیہ اور میرا یہ مشورہ کہ بھائی یہ تیر اور شکرہ ...... بہت ہو گئے اب غزل شروع کرو۔ یاد آیا کہ جس کشور ناہید کی شاعری پر تمہارا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا تھا۔ دھڑا دھڑ اس کے پاس یہ خط بھی جا رہے ہیں کہ واہ آپ کیا غضب کی خاتون اور شاعرہ ہیں اور یہ کہ تمہارے مجموعے کی رونمائی لاہور میں کرا دیں ......

ہم نے آج تک میری جان عارف! ایسی کوئی بات کبھی نہیں جو منھ پر بھی نہ کہہ چکا ہوں، چاہے فیض صاحب چاہے میرے یار سلیم احمد ہوں، چاہے میری جان شمس الرحمٰن فاروقی، چاہے قاسمی صاحب ہوں، چاہے وزیر آغا ......

میرے دوست محمد علی صدیقی سے یہ بھی پوچھ رہے تھے "کیا میں احمد فراز سے مزاحیہ بہتر شعر نہیں لکھتا"۔ صدیقی اور میں دیر تک ہنسے۔ بھائی تم فراز سے بہتر شعر کیسے لکھ سکتے ہو وہ تو تیس پینتیس سال سے شعر کہہ رہا ہے، پورا مصرع کہنا آتا ہے۔ میں اسے احساس و خیال اور الفاظ کے کلیشے کی وجہ سے چھوٹا شاعر اور برا شاعر سمجھتا ہوں۔ تم اسی قسم کی باتیں خود لکھتے ہو مگر اس سے بہت کم تر ......

ابھی لاکھوں باتیں اور ہیں جو دلی، لاہور، کراچی اور لندن میں بھی ہیں مگر میں تم پر زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ پہلے تین آج رات تمہیں رائٹ آف کر رہا ہوں ...... میں اپنے جلال سے بہت خوف زدہ ہوں ...... بے وقوف آدمی کیوں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا؟

فقط۔ ساقی

❖❖❖

ہم چاہتے تو معرکۂ شمیم و شاعر کو معرکۂ چکبست و شرر کی طرح طول دے سکتے تھے، اور قمر جمیل کو شامل کر کے اس معرکے کے عرض میں بھی معقول اضافہ کر سکتے تھے، لیکن اس قسم کا معرکہ آرائیاں طولاً و عرضاً تو کیا تعزیراً بھی ہمیں پسند نہیں ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ کالم ہم اپنے شوق کی خاطر لکھتے ہیں، اگر اس کے ذریعے دوسرے اپنا شوق پورا کرنے لگیں تو پھر ہم کیا کریں گے؟ حمایت علی شاعر کا مراسلہ چھاپ کر ہم نے جو غلطی کی تھی، اب اس کا خمیازہ شمیم احمد کے مراسلے کی صورت میں بھگتنا پڑ رہا ہے آئندہ ہم اس قسم کی کوئی غلطی کرنے اور پھر اس کا خمیازہ بھگتنے کا ارادہ نہیں رکھتے، اس لئے ان دونوں حضرات سے درخواست ہے کہ اس بحث کو ختم کر کے کوئی تعمیری کام کریں۔ مثلاً شمیم صاحب اپنے ممدوح کی شاعری پر ایک اور تنقیدی مقالہ لکھ سکتے ہیں اور شاعر صاحب اپنے ممدوح کی تنقیدنگاری پر محققانہ نظر ڈال سکتے ہیں۔ ان دونوں مقالوں کو استاد اختر انصاری اکبرآبادی کے رسالے "نئی قدریں" میں بآسانی چھپوایا جا سکتا ہے کہ بیس سال پہلے یہ بحث اسی رسالے میں شروع ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ "بآسانی" کا مطلب یہ ہے کہ استاد اکبرآبادی اپنے مضمون نگاروں سے صرف کتابت کے اخراجات وصول کرتے ہیں۔ کاغذ اور چھپائی وغیرہ کے اخراجات خود ادا کرتے ہیں۔

نظیر اکبرآبادی کے دیوان کی طرح شمیم صاحب کے مراسلے میں آپ کو متعدد مقامات پر نقطے نظر آئیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض الفاظ یا سلسلۂ صفات ہم سے پڑھے نہیں جا سکے، مجبوراً انہیں حذف کرنا پڑا اور "نقطہ نسلی" سے کام لینا پڑا۔ نقطوں کی شمولیت کی وجہ سے کہیں کہیں ربط عبارت کے لئے ایک آدھ لفظ بڑھانا پڑا ہے، ایسے تمام الفاظ قوسین میں دیئے گئے ہیں۔

محترم خارگوش صاحب! سلام مسنون

آپ تو ہماری ایک عادت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمیں چھوٹی ذات کے ترقی پسندوں کی ہر ادا بہت پسند ہے، ان کا غرّانا بھی اچھا لگتا ہے اور ...... بھی، ہمارے ...... حمایت علی شاعر سلیم بھی چونکہ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا یہ پرانا وطیرہ ہے کہ پیٹتے بھی ہیں، روتے بھی ہیں اور پھر غرّانے لگتے ہیں، ہم ان کی ان عادتوں کے پرانے شائق ہیں۔ لیکن یقین جانیے کہ ...... (ان) کے تازہ ارشادات اور خط آپ کے کالم میں پڑھ کر ہماری تو باچھیں کھل گئیں۔ لو آپ اپنے دام میں ...

نصف اوّل

و معرکۂ چکبست و شرر اور معرکۂ شمیم و شاعر

و غلطی اور غلطی کا خمیازہ!

و نکتوں کی جگہ نقطے!

صیاد آگیا۔ ایک تو اس لئے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم پڑھنے والوں کو یہ کیسے بتائیں کہ ہماری کتاب کا وہ واحد مضمون جس پر .... حمایت علی شاعر کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں شائع کیوں نہیں ہو سکا تھا اور یہ بھی کہ آخر ہمارے اس مضمون کی شان نزول کیا تھی مگر دعا دیجیے .... انہوں نے انتہائی اضطرار اور اضطراب کی حالت میں خود ہی وہ سارا مواد اور موقع فراہم کر دیا جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ آپ خود ہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر .... (وہ) چوری اور سینہ زوری کے بجائے سچ بولنے کا ایک بار بھی خطرہ مول لے لیتے تو ہمیں یہ تحریر لکھنے کا موقع کیسے ملتا؟

• شاعر گرہ کٹ " چونکہ ادبی گرہ کٹی اور چوری کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے جھوٹ بولنے، دھوکا دہی اور فریب کاری میں .... مہارت تامہ رکھتے ہیں اس لئے اپنے ۱۹۶۳ء کے خط مطبوعہ نئی قدریں کا انہوں نے جو اقتباس دیا ہے اس میں کمال فن کے ساتھ یہ بات گول مول رکھنے کی کوشش کی ہے کہ جسارت کے قارئین کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ ہمارا بقول آپ کے "شور انگیز" مضمون دراصل اسی خط کے جواب میں عرض کیا گیا تھا۔ جبکہ برخوردار نے کچھ ایسا دعویٰ کا دینے کی کوشش کی ہے کہ جیسے انہوں نے، ہماری کسی کارروائی کے نتیجے میں یہ خط لکھا تھا۔ آپ کو یہ بخوبی علم ہے کہ ہم نے ترقی پسندوں کے خلاف آج تک کوئی تحریر اس وقت تک نہیں لکھی ہے جب تک ان کی شامت اعمال کے نتیجے میں ادھر سے چھیڑ نہ ہوئی ہو .... سعادت اطوار کا خط آپ نے پڑھا بھی ہے اور چھاپا بھی ہے اب یہ فیصلہ قارئین جسارت خود کریں کہ اس خط کی ناپاک عبارت میں وہ کون سے اخلاقی اصول بلکہ بقول شاعر وادی مہران اسلامی اصول، اور کون سی اعلیٰ اقدار، معیار ادب اور حرمت قلم کا مظاہرہ کیا گیا ہے جس کی دھائی دیکر .... نے یہ خط جسارت میں شائع کرایا ہے۔ خیر ہمیں اس کی کوئی شکایت نہیں کیونکہ ہر .... یادہ گو اور کج کلا کا پرانا وطیرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی .... کا پورا استعمال کرتے ہوئے خود کو ہر اس اصول اور تعریف سے خارج سمجھتا ہے جس کی بظاہر دھائی دیتا ہے۔

ہمیں تو جس بات پر اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ .... (انہوں نے) خود کو کیسے معروف اور معتبر لکھنے والوں میں بھی بقول اپنے شامل کر لیا؟ جبکہ اسی خط کا ہر ہر لفظ اس بات کا ثبوت ہے کہ .... (ان) کی ادبی، اخلاق اور تہذیبی تربیت کیا رہی ہے اور ہمارا مذکورہ مضمون اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک ایسے .... کی ترار واقعی حجامت نہ کردی جائے وہ اپنے افعال شنیعہ اور قبیحہ سے باز نہیں رہتے اب ذرا آیئے اس خط کے اُن مندرجات پر بھی غور کریں جس میں اس "برادر یوسف" نے اپنے بقول بھائی سلیم احمد کو بھی ان ہی الفاظ اور انداز سے نوازا ہے اور ہم پر یہ احسان کیا ہے اُن کا چھوٹا بھائی سمجھ کر ہمیں پولیس اسٹیشن بُلا کر پٹوایا نہیں ہے۔ (ایک بات ہم اس .... شاعر کے کان میں کہہ دیں کہ ہمارا یہ دلالت کیش طریقہ نہیں کہ ہم پولیس کی مدد لیں ہم تو خود ....

ہاں تو اس برادر خاص نے اس خط میں یہ دعویٰ کیا ہے، کیونکہ وہ اپنے بھائی کی جنسی شاعری کے خلاف لکھ رہا تھا اور میں نے اس میں مداخلت بیجا کی لہٰذا اس .... نے ہمیں بھی اس میں سان لیا۔ بھائی سلیم احمد کی جنسی شاعری پر اپنے ردعمل کا کر "سوتیلے بھائی" نے اس ٹھاٹ سے کیا ہے جیسے یا تو انہوں نے سلیم احمد کے کان کھینچ کر انہیں ہشک کر دیا یا کم از کم اُن کے خلاف لکھ کر خود سلیم احمد پر بڑا احسان فرمایا تھا۔ اب یہ تو دونوں بھائی جانیں اور سلیم احمد خود فرمائیں کہ اُن کی مذکورہ شاعری جنسی تھی یا اس میں .... مگر اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے .... پروفیسر شاعری کی ماہیت اور شعری عمل کا کتنا ادراک رکھتے ہیں کہ جو شاعری معاشرے کے باطن میں چھپی ہوئی ناپاکی پر ایک طنز اور صدائے احتجاج تھی وہ سوتیلے بھائی کی نظر میں خود بھائی کی جنسی شاعری کا اشتہار کیسے بن گئی؟

یہ تو خیر ایک جملۂ معترضہ تھا .... (انہوں) نے ہاتھ کی صفائی کا کمال وہاں دکھایا ہے جہاں ایک زمانے کی کہانی اور واقعات کو صرف اپنی موجودہ احتیاج کو رفع کرنے کے لئے بیچ میں سے بیان کیا ہے .... ایک زمانہ تھا کہ ہمارے تعلقات میاں حمایت علی شاعر سے اتنے ہی دوستانہ تھے جتنے کسی بھی کراچی کے ہمعصر ادیب اور شاعر سے ہو سکتے تھے اور ہمارا نام اُن کے رسالے شعور پر آتا تھا۔ اس زمانے میں .... (وہ) ہمیشہ اکمر گلے کے عادی تھے (اور شاید یہ عادت در پردہ اب بھی باقی ہو) کہ مستند اور مشہور نقاد نیز ان کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے ہی میں اُن کے ہم عصر اور دوست بھی اپنا حق دوستی ادا نہیں کرنے جس کہ وہ کمال چالاکی سے نئے لکھنے والوں کو نظر انداز کرنے کا ایک احتمالی گلہ بنا کر ہر جگہ داد و فریاد کرتے نظر آتے تھے۔ اس ضمن میں انھیں ترقی پسند نقادوں سے خاص طور پر شکوہ رہتا تھا۔ اب یہ اُن کی بدقسمتی تھی کہ سب سے پہلے اُن کے جس دوست نے اُن کی اس داد و فریاد پر توجہ کی وہ عبدالرؤف عروج تھے اور انہوں نے جو داد تحقیق اور تنقید دی وہ یہ تھی کہ ہمارے .... شاعر نے اپنی نظم "بنگال سے کوریا تک" میں ساحر کی نظم "پرچھائیاں" پر ہاتھ صاف کر دیا ہے اس کا ذکر ہمارے مضمون میں بھی ہے ظاہر ہے کہ اس بے بھاؤ کی پڑی پر .... (اُن) پر بقول آپ کے کیا قیامت خیز عمل نہ گزر گیا ہوگا۔ چنانچہ موصوف اپنی کتاب آگ میں پھول بغل میں داب کر اس خاکسار کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ دراصل جب میں حیدرآباد دکن سے بمبئی پہنچا تو اپنی یہ نظم شروع کر چکا تھا اور میں نے ساحر کو سنائی اور ساحر نے اسے اُڑا لیا۔ یہ واقعہ میرے مضمون میں "ایک صاحب کے پاس جانے کے" حوالے سے آیا ہے اور اس کی تصدیق خود شاعر وادی مہران کی اس تحریر سے ہوتی ہے جو کلیم سکھر میں ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ (لیکن اس وقت تک .... (اُن) کو ہماری کتاب کی اشاعت کی خبر نہ تھی) ظاہر ہے کہ ہم دوستی میں کسی طرح بھی ایک کھلی ہوئی چوری کا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ اور ہمارا یہی وہ جرم تھا کہ شدہ شدہ نوبت اس خط تک پہنچی جس کو انہوں نے ۱۹۶۳ء میں "نئی قدریں" میں اور اب دوبارہ آپ کے کالم میں چھپوایا ہے۔ اور جس کی ناپاکی کے جواب میں ہمارا مقالہ "شور انگیز" ۱۹۶۳ء میں ہی تصنیف ہوا تھا جس پر شاعر وادی مہران نے ۲۰ سال بعد آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔

اپنی دوسری بات کہنے سے پہلے میں اسی خط کے حوالے سے .... (اُن) کی طبع زاد ذہانت اور ذہانت کے دو ایک نمونے پیش کرنا چاہوں گا۔ جب سے ہم نے اپنے مضمون میں .... (ان) کی چوریوں اور گرہ کٹی کو ثابت کر کے دنیائے ادب سے داد و تحسین حاصل کی تھی اس وقت سے اس کا صدمہ ظاہر ہے کہ (اُن کو) .... محسوس ہو رہا تھا۔ لہٰذا اپنی دانست میں ۲۰ سال بعد مجھ پر جو جوابی وار کیا ہے اسی کی برش کی داد دینا آپ بھی دے لیجیے۔ یعنی .... (انہوں) نے میرے مضمون کے دو لفظوں (شاعری۔ آخ تھو) پر یگانہ کے فقرے کے سرقے کا الزام لگایا ہے۔ یہاں ہم بھی واقعی اس .... عالم، شاعر، پروفیسر سب کے قائل ہو گئے۔ کیونکہ ہم ادب کے قارئین کو اتنا جاہل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ یگانہ کے اس مشہور فقرے .... (ان) کی طرح لاعلم ہوں گے۔ لیکن ہم نے سیاق و سباق کو پوری طرح پیش کرنے کی اپنی پرانی عادت کے مطابق ان دونوں لفظوں کو اسی طرح بریکٹ میں لکھا ہے جس طرح ابھی آپ نے اوپر دیکھا ہے۔ لیکن حمایت علی شاعر کی .... عینیت اس بریکٹ کو کہاں خاطر میں لاتی جب تک کہ ہم اس کے ساتھ یہ نہ لکھ دیتے کہ یہ بریکٹ کا نعرہ مرنا: حسن پاس گیا نہ چنگیزی لکھنوی تم عظیم آبادی کا ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی ہال میں اس

مصرع کو عنوان بنائیں۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد، تو پوری جدید اُردو شاعری کو بغیر حوالے کے ہضم کرنے کے باوجود یہ .... اوریجنل شاعر اور پروفیسر آپ پر بھی سرقہ کا الزام لگا دیں گے۔ کیونکہ آپ نے اس پر شاعر کا نام نہیں لکھا ہے۔

اس خانہ زاد ذہانت اور بصیرت کے بعد اُن کے تیرے پن کا ایک اور نمونہ۔ انہوں نے بقول آپ کی تحریر کے آپ کو میرا لکھا ہوا کوئی مضمون بھیجا ہے جس میں ......(ان) کی تعریف کی گئی ہے۔ خامہ بگوش صاحب واللہ آپ بھی بڑے بھولے بادشاہ ہیں کہ ایک عادی دروغ گو اور مشہور ڈکیت کے اس بیان سے دھوکا کھا گئے۔ اور یہ بھی بھول گئے کہ ہمارے ...... تیرے ترقی پسند ہونے کے ناطے عامۃ الناس کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے "آگ میں پھول" پر ایک تبصرہ کو مضمون اس لئے ارشاد فرمایا ہے کہ تاکہ لوگوں کو یہ دھوکا دیا جا سکے کہ لیجئے شمیم احمد تو شاعر وادیٔ مہران کی تعریف میں مضمون بھی لکھ چکے ہیں اور تعلقات کی خرابی کے بعد اب پروفیسر نظیر صدیقی کی طرح ہر چیز سے منکر ہو گئے۔ بھائی یہ ایک ایسا ہی تبصرہ تھا جیسے اب بھی "نیا دور" میں تبصرے کے لئے آنے والی ہر کتاب پر شائع ہوتے ہیں اور جس کے چند نمونے خود برش قلم میں بھی موجود ہیں اور ہم نے اُن کی تالیفِ قلب کے لئے ان کو ایک جدید ترقی پسند شاعر کی حیثیت میں متعارف کرایا تھا۔ یہاں ہم اتنی وضاحت اور کر دیں کہ ۱۹۵۶ء تک ہم بقول شاعر...... کے محض میٹرک اور ادیب فاضل تھے جس کو .... ایم اے کی ڈگری ...... والے شاعر وادیٔ مہران ہماری جہالت کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔ اور ہم کو یہ بھی اعتراف ہے کہ ہم خود بھی اس وقت تک ترقی پسندی کی جہالت سے نہیں نکل سکے تھے۔ گویا دو دو جہالتوں کا شکار تھے۔ مگر ہمیں بڑی حیرت اس بات پر ہے کہ ہماری میٹرک پاس تحریر کو تو بطور سند شعری علمی ہمارے ...... شاعر اخباروں میں بانٹتے پھر رہے ہیں لیکن ہماری اس وقت کی تحریر پر وہ بڑے چراغ پا ہیں جبکہ خیر سے ہم نے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا تھا۔ اور اب جبکہ ہم اپنے .... بسلمہ کی کوششوں سے ایم اے پاس ہیں اور اُن کی دعاؤں سے بالکل اُن کی طرح کراچی یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی ہیں۔ اور یہ پروفیسری بھی ہمیں کسی لابی یا جیب گیری سے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تو وہ خود اندازہ کر لیں کہ اب ہم اپنے علم و فضل آئندہ اُن پر جو مضمون لکھیں گے۔ اس سے ان پر کیا گزرے گی؟۔

خامہ بگوش صاحب معاف کیجئے گا خط بہت طویل ہوتا جا رہا ہے۔ دراصل کوئی بیس سال بعد ایک اوریجنل ...... ہاتھ لگا ہے تو قلم پر قابو نہیں رہا ہاں اب ہمارا وہ بنیادی سوال کہ ہمارا وہ مشہور مضمون جس پر ...... (وہ) اتنے مضطرب ہیں آخر "ناگفتہ" کیسے رہ گیا تھا اور ہماری کتاب کا واحد غیر مطبوعہ مضمون کیوں تھا۔ یہاں وہ .... بات بھی آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ شاید آپ کو شاعر مہران کی یہ دو گفتگو اور واویلے سے یہ دھوکا لگ گیا ہو کہ "برش قلم" میں شائع شدہ ہمارا مضمون انہوں نے بھیجا ہے۔ ایسی بات بالکل نہیں ہے۔ جب یہ مضمون مذکورہ خط کے جواب میں ۱۹۶۳ء میں ہی نئی قدریں کو بھیجا گیا تھا ہمارے ...... (شاعر) نے اسی وقت ملاحظہ کر لیا تھا اس کے نتیجے میں وہ سیدھے برادرم مشفق خواجہ صاحب کے پاس انجمن ترقی اُردو پہنچے تھے کہ خدارا اس مضمون کو شمیم احمد سے کسی طرح رکوا دو۔ اب ذرا قارئین اس بات پر تھوڑا سا غور فرمائیں کہ ...... (ان) کو اس وقت اپنے ...... برادرِ بزرگوار سلیم احمد یاد آئے نہ ہماری آپا کی مادرانہ شفقت یاد آئی۔ کہ خواہ مخواہ خود کو اس فہرست میں بھی موقع دیکھ کر شامل کر لیا جس میں کسی ...... کا نام تک نہیں تھا۔ نہ جمیل الدین .... عالی یاد آئے نہ جمیل جالبی کہ یہ دونوں بڑے عہدیدار بھی تھے اور ہمارے ان سے تعلقات بھی۔ یاد آئے تو مشفق خواجہ صاحب جن سے ہمارے اس وقت واجبی واجبی تعلقات تھے اور ہمارے ...... (شاعر) کے تو اتنے بھی نہیں تھے مگر آپ اس ...... کی داد دیجئے کہ یہ ضرورت انہیں یوں آن پڑی تھی کہ ہم انجمن ترقی اردو میں ملازم تھے اور مشفق خواجہ اس کے اسسٹنٹ سیکریٹری لہٰذا چالاک مگر بیوقوف شاعر وادیٔ مہران کو یہ یقین تھا کہ ہم پر زیادہ زور اسی صورت میں پڑ سکتا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب نے ہم سے یہ کام کیسے اور کن الفاظ میں لیا اور اس وقت برخوردار سعادت اطوار خود کہاں بیٹھے تھے یہ آپ حضرات خود مشفق خواجہ صاحب سے معلوم کر لیجئے۔ مجھے اس کا ذکر کرتے بھی اس شخص کی ...... سے شرم آتی ہے۔ خامہ بگوش صاحب! آپ نے ان کی تحریر چھاپ کر یہ اندازہ تو لگا لیا ہوگا کہ "آگ میں پھول" اور ۱۹۶۳ء تک برخوردار اپنی دیرینہ اور قدیمی یعنی سرقے کی عادت کو تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ ہمارے مذکورہ مضمون کی کسی مثال کی تردید اس نے اپنے وضاحتی بیان میں نہیں کی ہے۔ حد یہ ہے کہ اپنے سابقہ پیارے دوست عثمان عادل جس نے بقول خود شاعرِ وادیٔ مہران، اسے صاحبِ دیوان شاعر بنا دیا تھا اور حال کے "نام نہاد ناشر" کو تھانے بلوا کر پولیس والوں سے زد و کوب کرانے کے قبیح اور ترقی پسندانہ فعل کو بھی ان الفاظ میں پوری طرح قبول کر لیا ہے۔ "ویسا انجام تو اب بھی ممکن ہے" (...... ہر قسم کے جرائم کی یہ تفصیل قارئینِ جسارت ہماری کتاب برش قلم میں ملاحظہ کریں اور اپنی کاپی جلد محفوظ کرا لیں) بہرحال خامہ بگوش صاحب آپ سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ آئندہ اس قسم کی تکلیف آپ کو نہیں دیں گے لیکن اس کے لئے ایک درخواست ہے کہ یا تو آپ اپنے دوست حمایت علی شاعر سے کہہ کر ان کے وہ دونوں شعری مجموعے جو "آگ میں پھول" کے بعد شائع ہوئے ہیں ہمیں بھجوا دیں جن کا ذکر...... (انھوں) نے بڑے طمطراق سے آپ والے کالم میں کیا ہے کیونکہ ہم حق دیانت اور محنت کی کمائی "مال حرام" برطرف کرنے کے عادی نہیں اور آخر جب "آگ میں پھول" تبصرے کے لئے بھیجی جا سکتی ہے تو یہ کتابیں کیوں نہیں بھیجی جا سکتیں۔ یا اگر انہوں نے آپ کے پاس اپنی "مشہوری" کرانے کے لئے روانہ کی ہوں کیونکہ موصوف دنیا کی ہر صداقت سے زیادہ اہمیت اپنی "مشہوری" کو دیتے ہیں خواہ اس کے لئے نظریاتی قلابازیوں پر قلابازیاں کیوں نہ کھانی پڑیں یا دوستوں کے چہروں پر کالک کیوں نہ ملنی پڑے یا بھائیوں کی گردنیں ہی کیوں نہ اڑانی پڑیں، بہرحال آپ یہ کتابیں عاریتاً عنایت کر دیں۔ کیونکہ ہم اپنا اگلا مضمون ان ہی دونوں بیش بہا تصانیف پر لکھنا چاہتے ہیں اور وہ صرف کسی رسالے میں شائع ہوگا تاکہ آئندہ ریکارڈ پر رہے۔ اس مضمون میں ہم دراصل چار چیزوں کا جائزہ پیش کریں گے (۱) ...... (وہ) "آگ میں پھول" کے بعد اپنی پرانی قبیح عادتوں سے کچھ باز بھی آئے یا نہیں؟ یا اب بھی ساحر لدھیانوی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ (۲) ۱۹۶۳ء کے بعد ...... (انھوں) نے اپنی شاعری کے مال گودام میں مزید کہاں کہاں سے اور کیسے کیسے نوادرات جمع کئے ہیں نیز کن کن خوش گلو شاعروں یا اصلی گلوکاروں کے ٹینٹوے دبائے ہیں (۳) مذکورہ بالا زمانے اور بالخصوص پروفیسری کے مرتبے پر فائز ہونے کے بعد شعری اہلیت اور مبلغ علم میں کچھ ترقی ہوئی ہے یا اب بھی تیر تکے ...... لکھنے سے کام چل رہا ہے۔ ان کے تازہ مراسلہ کی ...... بدمذاقی اور ...... کے فن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کا خانہ خالی ہی ہے۔ (۴) ...... (وہ) ہمیشہ سے خانہ زاد قسم کے کمیونسٹ اور ترقی پسند تھے اور اندرون خانہ احباب اب بھی ہیں۔ مگر وہ ماسکو کی طرف پریڈ کرتے اور سرخ سلام کرتے ہوئے قرآن مجید کے حوالے تک کیسے پہنچ گئے۔ حوالے کے لئے ان کے خط کی آخری سطر ملاحظہ کیجئے اس تحقیق کی ضرورت یوں پیش آئے گی کہ اگر خودستائی نہ سمجھی جائے تو خاکسار کی دھر پکڑ کی وجہ سے اس قسم کے کئی سرخوں کو اسلام لانے کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔ مثلاً ...... (ان) کی اس تحریر میں مذکور ان کے ایک دوست پروفیسر عتیق احمد بھی عربی بولتے ہوئے برآمد ہوئے تھے۔ حوالے کے لئے دیکھئے برش قلم۔ انشاءاللہ اس تحقیق کی روشنی میں اگر ہم اگلے مضمون میں ...... (انھیں) داڑھی نہ رکھوا دیں تو ہمارا ذمہ۔ لیکن اس بار خدا کے لئے وہ ہمارا مضمون رکوانے کے لئے کسی "حاکم" کا سہارا نہ لیں تو ان کی صحت بھی اچھی رہے گی اور ان کی شاعری کی بھی۔

اب آخر میں آپ کے توسط سے ہم شاعرِ وادیٔ مہران سے بصد ادب عرض کرتے ہیں۔ سے اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ ہاں یاد آیا کہ یہ مصرع ہمارا نہیں بلکہ وزیر کا ہے۔

نیازمند، شمیم احمد ۱۳ر جون ۱۹۸۳ء کراچی

ملاقاتی ایک ملاقات ایک اپیل

ہماری خواہش تھی کہ چنگاری میں ایسی شخصیتوں پر مضامین، ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا جائے جن کے دم سے جینے کا حوصلہ ملتا ہے اور جو زمانہ اور زندگی کے صحرا میں نخلستان کی طرح مسافروں کو راہِ حیات پر گامزن رکھتے ہیں۔

دو تین شماروں میں ایسی شخصیتوں پر مضامین آئے بھی۔ ایک مسیحا نفس کی بات کے عنوان سے ڈاکٹر اگروال سے ایک تشنہ ملاقات بھی پیش کی گئی تھی۔ اور وعدہ کیا گیا تھا کہ پھر ان سے تفصیلی ملاقات کرائی جائے گی۔

اس بار جب میں نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے اپنے بارے میں بتانے کے بجائے اپنے دوستوں کے بارے میں بتانا پسند کیا۔ انھوں نے زور دیا کہ آپ سلامت علی مہدی کے بارے میں لکھئے اور اپنے قارئین سے درخواست کیجئے کہ وہ سلامت صاحب کی مدد کریں۔ سلامت علی مہدی سے میری بھی ملاقاتیں رہی ہیں اور ہر ملاقات میں ان کی شخصیت کا جادو مجھ پر اور زیادہ گہرا ہوا ہے۔

سلامت علی مہدی علم کا بحرِ زخار ہے، اس کی زبان میں جادو ہے۔ قلم میں زور ہے۔ سلامت علی مہدی جب لکھتا ہے تو پڑھنے والا اس کی تحریر میں ڈوب جاتا ہے اس کا قاری اس تحریر کا دیوانہ بن جاتا ہے۔ اور جب بولتا ہے تو سننے والا کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

"وہ کہے اور سنا کرے کوئی"

سلامت علی مہدی صرف صحافی نہیں ہے وہ مجاہد آزادی بھی ہے اور اس کا یہ جہاد آج بھی جاری ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ آزادی کا یہ داغ داغ اجالا فریب ہے آزادی نہیں۔

سلامت علی مہدی نے ناول بھی لکھے ہیں اس کا ایک ناول "زمرد" تو بلاشبہ اردو ناول کا شہکار ہے مگر ہمارے ناقدین جو انگریزی ادب کے حوالے کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے اس ناول کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا حالانکہ یہ وہ ناول ہے جسے شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنا ناممکن ہے اس کا ماحول بالکل طلسمی ہے اور اس کے کردار زندہ جاوید۔

سلامت علی مہدی میں چند خامیاں بھی تھیں مثلاً وہ بے تحاشہ پیتے تھے انھیں کچھ اور لت بھی تھی مگر اب انھوں نے ان سے کنارہ کر لیا ہے اس لئے کہ جس جان لیوا مرض نے انھیں اپنے دام میں گرفتار کر لیا تھا اس سے نجات کا بس یہی ایک راستہ تھا۔ ... اب سلامت علی مہدی روبہ صحت ہے۔

لیکن اسے ضرورت ہے دوا کی غذا کی تاکہ ایک بار پھر وہ قلم کا جادو جگا سکے ہمارے جذبات کی ترجمانی کر سکے۔

مہدی ہماری آواز ہے یہ ہمارا فرض ہے کہ اس چراغ کو بجھنے نہ دیں۔ اردو اکاڈمیوں، سرکاری اداروں اور افراد ان سب سے استدعا ہے کہ وہ سلامت صاحب کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔

اس لئے کہ سلامت علی مہدی جیسے لوگوں کی ہماری قوم کو ضرورت ہے۔ (باقی آئندہ)

ڈاکٹر اگروال

کتابوں کی باتیں

ب۔ا

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

ششماہی "انکار" جون ۱۹۸۳ء
(۲)

ایڈیٹر:۔ ابوالکلام قاسمی
قیمت:۔ پندرہ روپئے
سائز:۔ ۱۸×۲۲/۸
صفحات:۔ ۲۵۶

"انکار" علی گڑھ کے شمارہ نمبر (۲) جون ۱۹۸۳ء میں شمس الرحمن فاروقی کا مضمون چھپا ہے۔ "شعر شور انگیز" اسمیں انہوں نے میر کے اشعار کی تجزیاتی تشریح کی ہے اور حسب معمول بال کی کھال نکالی ہے یہاں میں "بال کی کھال" کو بُرے معنوں میں استعمال نہیں کر رہا۔ اس عمل سے جہاں ایک فائدہ یہ ہے کہ شعر کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ تشریحات اور معنی و مفہوم کی پرتیں سامنے آجاتی ہیں وہاں دوسری طرف ایک قباحت بھی پیدا ہوگئی ہے وہ یہ کہ انہوں نے بعض ایسی دور از کار معنی پیدا کئے ہیں جن سے شعر کا حسن مجروح ہوتا ہے اور طبیعت منغض ہوجاتی ہے سب سے بری بات یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے فاروقی اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ ہر بڑے شاعر میں ایک ایسی صفت ہوتی ہے جو اسے دوسرے شاعروں سے ممیز ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ میر کی صفت میریت یا اداسی جیسے بجا طور پر یاسیت تمناکی بھی کہا جاسکتا ہے مگر یہ اداسی، یہ غمناکی یا المناکی عرفان حیات کا نتیجہ ہے۔ زندگی کو اچھی طرح دیکھنے، برتنے سہنے اور سمجھنے کے بعد شاعر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ زندگی غم کا دوسرا نام ہے۔ یہ اداسی گوتم بدھ کی اداسی سے ملتی جلتی ہے جو زندگی کو دکھ ہی دکھ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ لیکن گوتم بدھ کی طرح میر کی اداسی بھی حوصلہ شکن یا حوصلہ افزا نہیں ہے۔ یہ انسان کو موت اور بے عملی کی طرف نہیں لے جاتی۔ اور نہ ہی عیش کو یا غم کو غرق مئے ناب کرنے کی تلقین کرتی ہے بلکہ میں نے اس اداسی کو عرفان حیات کا نتیجہ اس لئے قرار دیا ہے کہ یہ انسان کو تیاگ اور ترک کی طرف لے جاتی ہے ایثار پیشہ بناتی ہے۔ میر یا بدھ کی اداسی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ زندگی فانی ہے بلکہ ان کی اُداسی کی وجہ یہ ہے کہ زندگی دُکھ ہی دکھ ہے۔ اس کے سارے مظاہر سارا حسن ساری تخلیقات مبتلائے غم بھی ہیں اور وجہ غم بھی۔ میر کے نزدیک زندگی کی بے ثباتی بھی غمناکی یا دکھ کا ایک سبب ہے مگر سب سے بڑا سبب نہیں۔ جبکہ خان کے نزدیک زندگی کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ زندگی فانی ہے۔ میر کے نزدیک زندگی خواب نہیں بلکہ غم کا دریا ہے اور ہم سب اس کے قطرے ہیں ہم سب ایک عظیم غم کا جز ہیں۔

قیام کو بھی زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہے صرف احساس ہی نہیں انھیں غصہ ہے انکا غصہ اور خفگی کبھی کبھی اداسی میں بدل جاتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ جب زندگی کو آخر فنا ہی ہونا ہے تو پھر یہ تگ و دو، اور زندگی کرنے سے کیا فائدہ بہتر ہے کہ خود کو غرق مئے ناب کردو "میریت" طنز و تضحیک یا ہجو سے عبارت نہیں ہے۔ میر کا وہ کلام جسمیں اس طرح کے عناصر ہیں وہ میر کی عظمت کا سبب نہیں ہیں جس طرح میر کے یہاں بہت سارطب ویابس ہے اسی طرح طنز و تضحیک بھی ہے۔ میر کی عظمت کا سبب ہے ان کا عرفان حیات عرفان غم۔ فاروقی صاحب نے میر کے اشعار کی تجزیاتی تشریح کے وقت اس بنیادی بات کو نظر انداز کر دیا ہے اس لئے بعض ایسی باتیں میر سے منسوب کر گئے ہیں جو "میریت" کو مجروح کرتی ہے۔ مثال کے طور پر میر کے مشہور شعر ؎

"کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا"۔

کی تشریح کرتے وقت بات میں بات پیدا کرنے کے چکر میں وہ کئی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو میر سے ناواقف ہے۔

میر کا یہ شعر اردو شاعری کی روایات کو نظر انداز کر کے نہیں سمجھا جاسکتا۔ زندگی مسلسل ہے پھول اسکے بے شمار مظاہر میں ایک مظہر ہے کلی اسکا بچپن ہے پھول کی زندگی چاہے کتنی ہی عارضی ہو، دو روزہ ہو، کلی پھول بننے سے رک نہیں سکتی کلی مسکراتی ہے پھول بنتی ہے اور مرجھا جاتی ہے۔ یہی زندگی ہے۔ یہی زندگی کا راز ہے اور اس کا نتیجہ ہے غم، دُکھ ادہم میں پتنگ کاغذی دوڑ ہے اس کے ہاتھ میں غم کا یہی سبب ہے یہ غم عرفان حیات کا نتیجہ ہے۔ اس لئے محترم ہے پروقار ہے مقدس ہے۔

اس شعر میں نہ شاعر خود کلامی کرتا ہے نہ کسی سے سوال کرتا ہے "کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات" میں کوئی سوال نہیں ہے نہ خود کلامی ہے۔ اور نہ ہی کلی نے کچھ سنا ہے بلکہ یہ ایک طرز اظہار ہے۔ محسوسات کو الفاظ کا پیکر دینے کا بہانہ ہے۔

فاروقی نے میر اور قیام کے شعر کا موازنہ کرتے وقت بھی یہ حقیقت نظر انداز کردی کہ زندگی کے بارے میں دونوں شاعروں کے رویے میں بنیادی فرق ہے۔ میر کے نزدیک زندگی دکھ کا دوسرا نام ہے جبکہ قیام کے نزدیک زندگی فانی ہے اور اس لئے غرور کرنا نادانی ہے فارقی نے میر کے شعر ؎

عہد جوان رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

کا سودا کا شعر ؎

تھا یہ جوانی فکر و تردد لعد از پیری پایا چین
رات تو کاٹی دکھ سکھ ہی میں صبح ہوئی آرام کیا

سے موازنہ بھی کیا ہے۔ مجھے یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ ہر کلام منظوم شعر نہیں ہوتا۔ سودا کا "شعر" بھی محض کلام منظوم ہے۔ اسی طرح فاروقی نے میر کے شعر ہے

عالم میں آب و گل کے کیوں کر نباہ ہوگا
اسباب گر پڑا ہے سارا مرے سفر میں

کا غالب کے ایک شعر سے موازنہ کیا ہے۔ وہ یہاں پھر یہ بات بھول گئے کہ غالب کی صفت یعنی "غالبیت" "میریت" سے بالکل مختلف چیز ہے۔

غالب کو اس کی ذرا بھر پرواہ نہیں کہ وہ خان ہے۔ اسی لئے نہ وہ زندگی کو فانی سمجھ کر خفا یا اداس ہوتے ہیں نہ اسے دکھ کا مترادف سمجھتے ہیں ان کے نزدیک بت ہزار شیوہ ہے۔ وہ زندگی کو برتنے اور اس سے محفوظ ہونے کے قائل ہیں وہ شہد کی مکھی بننے کے قائل ہیں۔ غالب سے ہی ملتا جلتا رویّہ نظر کا ہے مگر وہ زندگی سے لپٹ لپٹ کر محفوظ نہیں ہوتے بلکہ ایک سیاح کی طرح زندگی کو برتتے ہیں وہ اسی میں مگن ہیں "ٹک دیکھ لیں، دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے"۔ یہ چل نکلنے والی خصوصیت ہی نظیر کو غالب سے الگ کرتا ہے۔

فاروقی نے اس مضمون میں آتش کو معمولی شاعر قرار دیا ہے اور ثبوت کے طور پر ان کا ایک خراب شعر نقل کیا ہے۔ اگر یہی رویّہ رہا تو دنیا کا ہر فنکار معمولی بلکہ گھٹیا قرار دیا جائے گا اس لئے کہ اسکی تخلیقات میں خراب اور گھٹیا تخلیقات بھی ہونگی۔ اسے کہتے ہیں چاول کے ڈھیر سے چنا اٹھا کر اس ڈھیر کو چنے کا ڈھیر ثابت کرنا۔

عمیق حنفی کا مضمون بہت عمدہ ہے مگر اس کے ابتدائی ڈھائی صفحات بالکل لغو ہیں۔

رالف رسل کا مضمون "کل ہند ترقی پسند مصنفین میں "قیادت کا عمل" قابل مطالعہ ہے مصنف نے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی ہے مگر وہ ایسے مصنفین سے ناراض ہیں جنہوں نے انگریزوں کو برا بھلا کہا ہو خاص طور پر وہ کرشن چندر سے ان کی تصنیف لندن کے سات رنگ کی وجہ سے زیادہ ناراض ہیں۔

اس شمارے کی جان ہے قرۃ العین حیدر کا "قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔" (عالم آشوب)

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"آج کی نسل اس لفظِ مرگ سے مسحور ہے۔ ان سب کو مرگ پسند اور BRUTALISE کس نے کیا۔ آپ نے۔ اور آپ نے۔ اور آپ نے۔ آپ سب مجرم ہیں۔" راحت کے محلوں کو بلا پوچھ رہی ہے۔ واجب القتل ہیں۔ ہستی کے مکانوں کو فنا پوچھ رہی ہے۔" سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔" نقد بر اپنی عمر فنا پوچھ رہی ہے۔" قتل کردئے گئے۔ ان جوانوں کی مرگ طرح طرح کے بھیسوں میں آرہی ہے۔ بندوقچیوں کی باڑھ۔ شہری فسادی کا چھرا۔ پولیس کا "این کاؤنٹر" اور خانہ ساز پستول۔ (مجھ کو تو خانہ ساز دے) اور کیسری وردیں میں ملبوس پریڈ کرتے نوجوان ان سب کو اور ان مرجیوں اور کو جن کے باپ دادا خود مظلوم شہید ہوئے ان سب کو کس نے BRUTALISE کیا۔

آپ نے اور آپ نے اور آپ نے آپ سب مجرم ہیں۔

مکانوں پر بل ڈوزر چل گئے۔ مکانوں پر بل ڈوزر برسوں سے چل رہے ہیں!

کوہن آج ان کے متعلق اسٹوری

ملبے کے ڈھیر، لاشوں کے انبار، جلے ہوئے گھر۔

غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں
وہ شب کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
ہر دم زمین کی نکلتا تھا یوں بخار
جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار
ننھے بچوں کا یہ عالم ہے کہ گھبراتے ہیں
گود میں ماوؤں کے دہشت سے چھپے جاتے ہیں
ننگی تلواریں جو ظالم انھیں دکھاتے ہیں
بس تو چلتا نہیں اشک آنکھوں میں بھر لاتے ہیں
نہ تو کر سکتے ہیں فریاد نہ رو سکتے ہیں
چپکے سہمے ہوئے اک اک کا منہ تکتے ہیں

ملبے میں ہر طرف کھلونے اور ننھے منے جوتے اور ننھے منے کپڑے۔

کل مجھے لوٹ کا اسباب جو دکھلایا تھا
اک پھٹے کپڑے پہ حاکم کو بھی غش آیا تھا
اک علم تھا اسی اسباب میں خورشید نشاں
مشک بیچے میں بندھی خون میں بھر پرافشاں
ایک گہوارے کی خوشبو سے یہ ہوتا ہے عیاں
کہ ابھی اٹھ کے سدھارا ہے کوئی غنچہ وہاں
بیچ میں تکیوں کے ننھا سا شلوکہ دیکھا
دودھ اگلا ہوا اور داغ لہو کا دیکھا۔

ایک سات سالہ بچی دہشت زدہ اپنے کھنڈر مکان میں لاشوں میں گھری ایک خالی ٹین کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ بلک بلک کر رو رہی ہے۔

اچھی نہیں عادت نہ رویا کرو بی بی
پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی
کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں
مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں
جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی
ہزاروں ہزار یتیم بے خانماں بچے
بیٹی کے سوا آپ کا کوئی نہیں بابا
شب بھر میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا
میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔
میں صرف پانچ سال کا ہوں۔

"بچوں کے سراب کٹ کے نشانوں پر چڑھینگے"
"استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے۔"

ٹیلی ویزن کی چینل بدلئے۔

مگر اس چینل پر کوئی تصویر نہیں سناٹا ہے سناٹا؟ جی نہیں یہاں سب خیریت ہے۔ برضائے الٰہی۔ منافقین اور زمین پر فساد پھیلانے والوں کو چن چن کر ختم کر دیا گیا۔ واجب القتل تھے۔ جو باقی ہیں انشاءاللہ ان کو بھی۔

"قید خانوں میں اسیر منتظر اجل بیٹھے ہیں۔"

آنکھوں پر سیاہ پٹی اور بندوقچیوں کے

گولیوں کی باڑھ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندوں کو آنے کی اجازت نہیں۔ وہ شیطان عظیم کے کارندے۔

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے؟
ہند ہرگز نہیں آئے گی۔ کاہے کو آنے لگی
سب کو اپنے اپنے قومی مفاد کا خیال ہے صاحب
لائن سے اپنی قبریں کھود کر سب اس قطار میں
آجائیں۔ جلدی جلدی۔ افراتفری نہیں سستی
نہیں ڈسپلن آخر دم تک ضروری ہے۔

کچھ کفن کے لئے ہمراہ نہیں لایا ہوں
باپ کو چھوڑ کے بے گور و کفن آیا ہوں
فکر مت کرو۔ کفن سرکاری ملیں گے۔

پھاوڑے قرینے سے رکھ دیجئے دوسرے آرہے ہیں۔

کاؤنٹ ڈاؤن۔ دس۔ نو۔ آٹھ۔ سات چھ۔ پانچ۔ چار۔ تین۔ قید خانوں میں کمسن لڑکے لڑکیاں منتظر اجل بیٹھے ہیں۔ دنیا کے ایوانوں میں اقتدار کی راہداریوں میں انکی آواز نہیں پہنچتی۔ کوئی ان کو چھڑانے نہیں آتا۔

متبسم اور خلیق کمانڈانٹ نے اسی اخلاق سے جھک کر جواب دیا "جی نہیں پہلے غسل بعد میں

وہ سب دو بڑے بڑے کمروں میں لے جائے گئے۔ مرد ایک طرف عورتیں دوسری طرف۔ جہاں انھوں نے اپنے کپڑے اتارے، کنٹوپ اور دستانے کوٹ اور کپڑے اتار کر کھونٹیوں پر قرینے سے ٹانگے۔ جس طرح ان کو ان کے گھروں پر اور اسکولوں میں سکھلایا گیا تھا کپڑے اور جوتے اتارتے وقت بچے آپس میں ہنستے اور لڑتے بھی جاتے تھے۔ ایک بچے نے اپنی ننھی بہن کی چٹیاں کھینچیں۔ ایک بڑی لڑکی نے اسے ڈانٹا۔ نرسوں کی سفید پوشاک میں ملبوس چند فربہ عورتیں اندر آئیں اور ان سب کو نکال کر ایک بڑے ہال میں لے گئیں۔ مرد اور عورتیں دوسرے دروازوں سے ہال میں داخل کئے گئے۔ پھر سارے دروازے بند کر کے گیس کے سلنڈر کھول دئے گئے

چالیس سال بعد ان دانشور بوڑھوں اور نوجوان فنکاروں اور معصوم بچوں کے رشتے دار جو اور جگہوں پر زندہ بچ گئے تھے انہوں نے ــــ

وہ پہاڑیاں بے حد حسین ہیں جن پر سیدار اگتے ہیں۔ وہاں خلیل اپنے المصطفیٰ کے لئے گیت لکھتا تھا۔ نیلا سمندر اور سرسبز کوہسار اور افسانوی قلعے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے کے اور جدید ترین جھلجھلاتی عمارتیں

کوفے سے ایک ناقہ سوار
گیس میں نہانے والوں کی باقی ماندہ اولاد اور ان کے باقی ماندہ رشتہ داروں کی اولاد پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں طیاروں کے پر بنا کر آئے۔

ناقہ سوار آیا ناگہاں
مرحبی بمبار بند دستے۔ آئے

ان لشکروں کے نام رکھیں۔ ابو الخوق، ارزق نوفل۔ ابن زیاد۔ سنان بن انس۔ حنظلہ۔ خولی انہوں نے خوشنما بم گرائے جنھیں معصوم بچوں نے کھلونے سمجھ کر اٹھایا اور بھسم ہوئے۔

"فرمائیے آپ کس قسم کی اذیت اور موت اپنے لئے پسند فرمائیں گے۔؟ بڑی ورائٹی ہے آجکل چند آئٹم سیکرٹ ہیں۔

علاوہ ازیں اس شمارے میں شمس الرحمان کے سوال اور تخلیق کاروں کے جواب بھی ہیں جن میں سے ہم سوالات اور صرف قرۃ العین حیدر کے جواب اسی شمارے میں پیش کر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ نظمیں، غزلیں، مضامین ہیں حسن نعیم کا تبصرہ قابل ذکر ہے۔

●●●

آگ کے ہم سائے :۔ احمد یوسف
صفحات :۔ ۱۳۸
قیمت :۔ پندرہ روپے
ملنے کا پتہ :۔ یک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۴
یہ مجموعہ جدید اور علامتی افسانوں کا ہے مصنف صف اوّل کا افسانہ نگار ہے۔ یہ اس کا دوسرا مجموعہ ہے۔ مصنف شروع میں ہی اپنے دل کی بات چند سطروں میں ہی کہہ جاتے ہیں۔

"یہ ضرور ہے کہ ان قصوں نے تو خوشنما ملبوسات زیب تن کر لئے ہیں۔ بستیوں میں رونق آگئی ہے۔ شور اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے دباؤ سے ہمارے دل بیٹھے جا رہے ہیں اور رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ اس کا ساتھ دیتے دیتے ہماری سانسیں اکھڑ جاتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، قصے کا بنیادی عنصر وہی ہے۔ جو کل تھا۔"

مصنف کے ہر افسانے میں درد و کرب کا اظہار ہے۔ مصنف سماجی ناانصافی۔ زندگی کی ناہمواری۔ انسانوں کی ذہنی کشمکش۔ مسائل و مصائب اور مکروہ حقیقتوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ ان کے اسباب کو بے نقاب کرتا ہے۔ مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔

افسانے ہی جدید نہیں بیان کرنے کا رنگ و آہنگ بھی جدید ہے۔

"چراغ کشتہ" پہلا افسانہ ہے۔ ایک ملازم ہے۔ اپنی کہانی سنانا شروع کرتا ہے اور ایک عہد کی کہانی سنا جاتا ہے۔ یعنی خود ہی ایک کردار بن جاتا ہے۔ "ورثہ" کا الفاظ دیکھئے۔

"ان کا باپ تو پھر بھی معصوم تھا کہ صرف کفن ہی چراتا تھا۔

یہ تو کفن بھی چراتے ہیں اور مردے کی بے حرمتی بھی کرتے ہیں۔

آخری افسانہ "وہ ایک شخص" ہے
آبادی میں ایک مست نکل آیا۔
شہباز کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے کھڑے ہو کر خلقت کو خطاب کیا۔

"میرے بھی وہ تھا جو کبھی سرسبز شاداب کھیت۔ گیہوں اور گیہوں کی روٹی کی رٹ لگایا کرتا تھا۔ کبھی جوتا۔ دھاگا۔ سوا اور موم کی رٹ لگا رہا ہے۔"

پورے مجموعہ کو آپ اس ایک شعر کی ترجمانی کہہ سکتے ہیں۔ "غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے"
کتابت۔ طباعت عمدہ ہے۔ قیمت صحیح ہے۔

کم قیمت پر عمدہ کتابیں خصوصی کمیشن

کتاب : ایڈیٹ (۱)
مصنف - دستوفسکی
نوعیت - ناول
مترجم - ظ - انصاری
صفحات - ۹۲۵
سائز - ۱۸×۲۲/۸
قیمت - ۱۸ روپے (مجلد)

(۲)
کتاب : منزل کی تلاش
مصنف - گورکی
نوعیت - سوانحی داستان
مترجم - رضیہ سجاد ظہیر
ایڈیٹر - انور عظیم
صفحات - ۲۰۴
قیمت - ۳ روپے (مجلد)
سائز - ۱۸×۲۲/۸

(۳)
کتاب : مہ و سال آشنائی
مصنف - فیض احمد فیض
نوعیت - یادیں منظوم ترجمے وغیرہ
صفحات - ۱۳۶
سائز - ۱۸×۲۲/۸
قیمت - ۵ روپے (مجلد)

(۴)
کتاب : منتخب تصانیف
مصنف - پوشکن
نوعیت - ناول نثری نظمیں وغیرہ
مترجم - ظ - انصاری
صفحات - ۳۵۲
سائز - ۱۸×۲۲/۸
قیمت - ۶ روپے

(۵)
کتاب : شعر و شاعری
مصنف - پوشکن
نوعیت - منظوم ترجمے
مترجم - ظ - انصاری
صفحات - ۲۲۶
قیمت - ۵ روپے (مجلد)
سائز - ۱۸×۲۲/۸

(۶)
کتاب : جب دھرتی جاگی
مصنف - شولوخوف
نوعیت - ناول (دو حصے)
مترجم - انور عظیم
صفحات - ۱۰۳۰
سائز - ۱۸×۲۲/۸
قیمت - ۱۸ روپے دس پیسے

(۷)
کتاب : بہار کے سترہ لمحے
مصنف - پولیان
نوعیت - ناول
مترجم - مرزا اسماعیل بیگ
صفحات - ۳۶۰
سائز - ۱۸×۲۲/۸
قیمت - ۵۰-۹ روپے

(۸)
کتاب : پانی کا قطرہ سونے کا ذرہ
مصنف - رحمان
نوعیت - کہانیاں
مترجم - منظر سلیم
صفحات - ۱۹۷
قیمت - ۵۰-۳ روپے
سائز - پاکٹ بک

(۹)
کتاب : جنگلی کتا (داستان پہلی محبت کی)
مصنف - رودیم - ان - مان
مترجم - خدیجہ عظیم
نوعیت - ناول
صفحات - ۲۶۸
قیمت - ۴ روپے
سائز - پاکٹ بک

(۱۰)
کتاب : سفید جہاز
مصنف - چنگیز
نوعیت - ناول
مترجم - رحمان
صفحات - ۲۸۶
سائز - پاکٹ بک قیمت -
سائز - پاکٹ بک
قیمت - ۵ روپے

(۳)
کتاب : جدلیاتی مادیت
مترجم - مرزا اشفاق بیگ
مصنف - مارکس، اینگلس، لینن
صفحات - ۴۸۰
قیمت - ۵ روپے
سائز - ۱۸×۲۲/۸

(۴)
کتاب : تاریخی مادیت
مصنف - مارکس، اینگلس، لینن
مترجم - تقی حیدر
صفحات - ۵۸۰
قیمت - ۶ روپے
سائز - ۱۸×۲۲/۸

(۵)
کتاب : منتخب تصانیف
مصنف - لینن
صفحات - ۴۸۸
قیمت - ۵۰-۴
سائز - ۱۸×۲۲/۸

(۶)
کتاب : کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو
مصنف - مارکس، اینگلس
صفحات - ۷۷۰
قیمت - ۵۰ پیسے
سائز - ۱۸×۲۲/۸

(۷)
کتاب : اقتدار میں عوام الناس کی شرکت
مصنف - لینن
صفحات - ۳۱۸
سائز - ۱۸×۲۲/۸
قیمت - ۳ روپے ۲۵ پیسے

(۸) کیمونزم میں بائیں بازو کی طفلانہ بیماری
(۹) آخری خطوط اور مضامین

بچوں کیلئے رنگین تصویروں سے مزین کم قیمت پر عمدہ کتابیں

(۱)
تصویروں میں چٹ پٹی کہانیاں
مترجم - ظ - انصاری
صفحات - ۴۸
قیمت - ۲ روپے
سائز -

(۲)
دوست
مترجم - شکنتلا
صفحات - ۲۸
قیمت - ۵۰-۴
سائز - جہازی

(۳)
آفتابی ہمسوا
مترجم - حبیب الرحمان
صفحات - ۵۰
قیمت - ۳ روپے

(۴)
ایک دو تین
مترجم - شکنتلا
صفحات - ۱۶
قیمت - ۲۵-۱
سائز - جہازی

(۵)
چڑیوں کی کہانیاں
مترجم - امیر اللہ خاں
صفحات - ۱۰۸
سائز - جہازی

(۶)
کتا اور شیر
مصنف - لیو تالستائی
مترجم - ظ - انصاری
صفحات - ۲۵
قیمت - ۷۰ پیسے
سائز - جہازی

کتابیں جن کا مطالعہ ضروری ہے

(۱)
کتاب : مختصر تاریخ عالم (۲ جلدیں)
مصنف - پروفیسر اے - مان فریڈ
ترجمہ - امیر اللہ خاں
صفحات - ۱۳۳۰
قیمت - ۲۵ روپے
سائز - ۱۸×۲۲/۸

(۲)
کتاب : معاشرے کی سائنس
مترجم - حبیب الرحمان
صفحات - ۵۷۵

عصری آگہی پبلی کیشنز - ۱۴۱۰/۳ رام نگر - شاہدرہ - دہلی - ۳۲

چالیس ادیبوں کی منتخب مزاحیہ اور طنزیہ تخلیقات پر مشتمل

کالم نگار نمبر

- نہ صرف ڈیڑھ سو سال کی تاریخ، صحافت، اور سماجی و سیاسی نشیب و فراز کی دلچسپ داستان پیش کرتا ہے۔
- بلکہ اُردو زبان کی زبردست قوتِ بیان اور اردو ادیبوں کے جرأت اظہار کی بہترین عکّاسی بھی کرتا ہے۔
- فوٹو آفسٹ کی طباعت کے ساتھ تصاویر سے مزیّن۔

چند فن کار: منشی سجّاد حسین۔ رتن ناتھ سرشار۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ خواجہ حسن نظامی۔ حاجی لق لق۔ عبدالمجید سالک۔ ملا رموزی۔ ساگر چند گورکھا۔ چراغ حسن حسرت۔ قاضی عبدالغفار۔ شوکت تھانوی۔ کنھیا لال کپور۔ ابراہیم جلیس۔ تخلص بھوپالی۔

مرتب: فکر تونسوی۔ پانچ سو صفحات۔ قیمت صرف ۱۰۰ روپئے۔ چنگاری کے خریداروں کو خصوصی رعایت۔

چنگاری ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی نمبر ۳۲

چنگاری کے غزل نمبر سے پہلے بھی کئی رسائل کے غزل نمبر شائع ہوئے ہیں

- مگر چنگاری کا غزل نمبر ان تمام نمبروں سے مختلف اور منفرد ہوگا۔
- اس نمبر میں کلاسیکی شعرا کی غزلوں کا انتخاب تو ہوگا ہی۔
- مگر اہم ترین حصہ ان غزل گو شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک نمایاں ہوئے۔
- اس سے بھی اہم حصہ ان غزل گو شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا جو تقسیم ملک کے بعد نمایاں ہوئے۔
- تمام نئے، پرانے غزل گو شعرا کے سوانحی خاکے کے علاوہ ان کی غزل گوئی پر مختصر مضامین ہوں گے۔
- غزل میں کلاسیکی، نئے، جدید اور جدید ترین رجحانات، اور تجربات پر مضامین ہوں گے۔
- غزل کی تاریخ، اس کی اہمیت، اس کے ارتقا، دوسری زبانوں میں اس کی مقبولیت پر مضامین ہوں گے۔
- تمام غزل گو شعرا کی دستیاب اور نایاب تصاویر ہوں گی۔
- یہ نمبر قارئین اور غزل کے شائقین کے لئے تو اہم ہوگا ہی۔
- طلبا کی درسی ضروریات کی بھی تکمیل کرے گا۔
- اگر آپ غزل کہتے ہیں تو اپنی پانچ غزلیں، تصویر اور بایو ڈاٹا ارسال کیجئے۔

پندرہ روزہ چنگاری ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

R. N. 36930 80 Regd. No. D (E) 49 Price Rs- 2- 00

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت

★ پندرہ روزہ چنگاری ایک ایسا رسالہ ہے جسے خاص و عام دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے اور زرِ سالانہ ۴۵ روپے ہے۔

★ راجندر سنگھ بیدی نمبر کی قیمت ۶۵ روپے ہے۔

★ سعادت حسن منٹو (ایک نفسیاتی تجزیہ) کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

★ لوکاچ اور مارکسی تنقید مصنّفہ اصغر علی انجینیئر، کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

چنگاری، منٹو، بیدی اور لوکاچ کی مجموعی قیمت ۱۷۰ روپے ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمیں ۱۲۰ روپے ارسال کردیں تو بیدی نمبر، منٹو اور لوکاچ آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیا جائے گا اور ایک سال کے لیے چنگاری آپ کے نام جاری کردیا جائے گا۔

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ

★ اگر آپ پندرہ روزہ چنگاری یا ماہنامہ عصری آگہی کے سالانہ خریدار ہیں تو آپ کو ہر کتاب کی خریداری پر پندرہ سے بیس فیصد کمیشن دیا جائے گا چاہے آپ ہمارے ادارے کی کتاب خریدیں یا ہمارے توسط سے کسی دوسرے ادارے کی کتاب۔

پتہ:-

عصری آگہی پبلی کیشنز، ۱۴۱۰/۳ - رام نگر، شاہدرہ دہلی ۳۲